کھڑکی کے اُس پار

کرونا کے شب و روز

مصنفہ

نعیم فاطمہ علوی

کھڑکی کے اُس پار

کرونا کے شب و روز

مصنفہ

نعیم فاطمہ علوی

نیشنل بک فاؤنڈیشن
اسلام آباد

نام کتاب: کھڑکی کے اُس پار

مصنفہ: نعیم فاطمہ علوی



نگران: ڈاکٹر راجہ مظہر حمید

انچارج مطبوعات: منصور احمد

اشاعت اول۔ طباعت اول: جولائی 2022ء | **صفحات:** 214 | **تعداد:** 1000

قیمت: -/415 روپے

کوڈ: GNU-807، **آئی ایس بی این:** 978-969-37-1300-8

طابع: نسٹ پریس، اسلام آباد

نیشنل بک فاؤنڈیشن کی دیگر مطبوعات کے بارے میں معلومات کے لیے رابطہ کیجیے

ویب سائٹ: www.nbf.org.pk یا فون: 051-9261125

یا ای میل: books@nbf.org.pk

انتساب

جانثار بھائی امان اللہ اور سیف اللہ

خون بن کر رگوں میں دوڑنے والے میرے بچے

فہد ہارون اور سائرہ

اور شادی کے آٹھ سال بعد سائرہ

کے گھر آنگن میں کھلنے والی کونپل

میری نواسی زہرہ احمد کے نام

فہرست

پیش لفظ

انسان ساری زندگی مصلحتوں کی دلفریب اور خوش رنگ چادر اوڑھے حالتِ نیند میں رہتا ہے۔ دِل و دماغ کی بغاوتیں، عداوتیں، محبتیں، الفتیں، سمجھداریاں اور ہوشیاریاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

تو پھر انسان سچ کب بولے...... میں جانتی ہوں سچ کے پل صراط سے گزر کر سرخرو ہونا کوئی آسان کام نہیں۔

اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔

کھڑکی کے اُس پار یادوں کی وہ گٹھڑی ہے جسے میں برسوں سے سنبھالے پھر رہی تھی۔ زندگی کے موجودہ دور میں مصروفیت کا یہ عالم رہا کہ اِن یادوں کی برکھا نے برسنا ہی چھوڑ دیا...... وہ باتیں، یادیں اور خوابوں کی برساتیں جو برستی تھیں تو تن من بھگو دیتی تھیں...... اب خشک سالی کا شکار ہو کر بنجر ہونے لگی تھیں...... اچانک کورونائی ماحول نے پھر سے جل تھل کر دیا۔ کھڑکی کے اس پار ان دنوں کی یادیں ہیں جب کورونا کے خوف سے ہم گھروں میں مقید ہو گئے تھے اور خیالات کا منہ زور گھوڑا کبھی پیچھے کی طرف سرپٹ دوڑنے لگتا اور کبھی گرد و پیش کی ہریالی میں ہی کھیل کود کر خوش ہو جاتا۔

...... یہ ایک عام سی مڈل کلاس عورت کی کتھا ہے جو کبھی خاص تھی ہی نہیں...... مگر زندگی تو اُس نے بھی آن بان شان سے گزاری۔ ہنستی روتی سسکتی اور کبھی خوشیوں اور مستیوں سے بھرپور راجکماری کی طرح...... زندگی کے اِس سفر میں ہر انسان کی کتھا کا رنگ ڈھنگ جدا ہوتا ہے...... نظریہ مختلف...... کردار مختلف...... امتحان مختلف...... زندگی گزارنے کا سلیقہ مختلف...... اور پھر اِس کے ساتھ جڑے رویّے مختلف......

اِس کتاب کا ہر لفظ ٹپکے کا آم ہے جو قدرت کی بھٹی میں پک کر تیار ہوا۔ فطرت کی آغوش

میں پروان چڑھا اور پھر خود بخود میری گود میں آ ٹپکا...... میں نے کوئی رنگ آمیزی نہیں کی۔ مینا کاری نہیں کی، نہ غازہ، نہ سرخی، نہ پاؤڈر......بس جوں کی توں......

کورونا کی پہلی، پھر دوسری لہر نے خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا......کھڑکی کے پاس بیٹھ کر باہر کی دنیا کو دیکھنے کا سفر بھی طویل ہوتا چلا گیا......موسم بھی بدلتے رہے......کبھی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر دھوپ کی شعاؤں سے لطف اندوز ہوتے رہے اور کبھی ان سے بچنے کے لیے آرگینزا کے پردوں کو پھیلانا پڑا تا کہ دھوپ کی تمازت سے بچا جاسکے۔

کورونا نے کچھ زیادہ ہی خوفزدہ کر دیا تھا اور کچھ زیادہ ہی مقید بھی......کئی شناسا چہرے منظر سے غائب ہوتے جا رہے تھے۔ ہماری گلی میں بھی کافی لوگ متاثر ہوئے...... بلکہ کورونا کے سبب وفات بھی پا گئے...... بدلتے موسموں نے میری کھڑکی کا موسم بھی بدل دیا۔ درختوں نے پھیلنا شروع کر دیا، جس کی وجہ سے کھڑکی سے لہلہاتی ٹہنیوں نے باہر کا منظر کچھ دھندلا سا کر دیا تھا۔ درختوں کی اوٹ سے راہ چلتے لوگ کوشش کے بعد ہی نظر آتے۔ ان درختوں کے پتے دھوپ سے چمکتے ہوئے بھی اچھے لگتے اور اِن پتوں اور پھولوں سے چھیڑ خانی کرتی دھوپ کی شعائیں، نظریں بچا کر اِسی کھڑکی سے میرے ڈرائینگ روم میں پہنچتیں تو کمرے کا ذرّہ ذرّہ روشن ہو جاتا۔ میرے پاس عصرِ حاضر میں دوستوں کی نئی آنے والی کتابوں کا ڈھیر تھا۔ کاغذ اور قلم بھی ساتھ ہی دھرا تھا۔ کبھی کچھ لکھ لیتی۔ کبھی کسی کتاب کی ورق گردانی کر لیتی اور کبھی پاس پڑی نٹنگ سے لطف اندوز ہونے لگتی۔ زندگی مہربان ہے اور بظاہر اندر کا موسم پُرسکون......

مگر تخلیق کار پُرسکون کیسے ہو سکتا ہے۔ گرد و پیش کی خبریں۔ ملکی حالات، دھرنے، احتجاجی ریلیاں، غربت، مجبوری اور ملک میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری، اِن سب سے غافل کیسے ہوا جا سکتا ہے۔

میں نے دیواروں پر لٹکی بچوں کی تصویریں دیکھیں تو دکھ سے سوچا...... آمد و رفت پر پابندیوں کی وجہ سے نہ جانے اب ان سے ملاقات بھی ہو نہ ہو۔ ننھے منے آنسوؤں کے قطرے میری آنکھوں سے چھلکے تو پھر چھلکتے ہی رہے۔

کھڑکی کے اُس پار چند فرلانگ پر گزرتی پیرودھائی روڈ دماغ کی رگوں میں دوڑنے

پھرنے لگی۔ زندگی اور موت کے درمیان بس اتنا ہی فاصلہ تو رہ گیا ہے۔ اِس شہر سے اُس شہر تک صرف چند لمحوں کی مسافت......

خوشیاں کیا ہیں؟

نہ خرید و فروخت کی طلب...... نہ بھرے بازاروں کو دیکھنے کی تڑپ...... نہ رشتے ناطوں میں کشش، نہ ضرورتوں کی دھما چوکڑی......

اب تو صرف انسانیت ہی کا رشتہ رہ گیا ہے۔ خدمتِ خلق کی خوشی...... اور دوست احباب سے ناطہ...... بچوں کو پال پوس کر اُن سے الگ ہو جانا، موت کے تجربے کی تربیت ہے۔

میں نے اپنے فون پر فیس بک کھولنے کے لیے فون اٹھایا تو میرے بہت محترم استاد خواجہ ذکریا صاحب کا پیغام تھا۔ ''مجھے اپنا ایڈریس بھیجیے۔ میں اپنی تازہ تصنیفات بھیجنا چاہتا ہوں۔

مجھے لگا میرے اندر بھک سے ایک شمع روشن ہوگئی اور میرے وجود میں جینے کی تمنا جاگ اٹھی۔ میرا روں روں خوشی سے جھوم اٹھا...... اور مجھے لگا...... خوشیاں تو یہ ہوتی ہیں۔ بے قدری نے منہ چھپا لیا اور فخر و انبساط نے دِل و دماغ کے نہاں خانوں سے جھانک جھانک کر مسکرانا شروع کر دیا۔

خواجہ ذکریا صاحب کی یادوں نے کھڑکی کے پار کا منظر غائب کر کے میرے سر پر دستِ شفقت رکھ دیا اور میں یاد کرنے لگی۔

خواجہ ذکریا صاحب کی کلاس میں ہم نے دو سال تک اُن کے لیکچرز سے استفادہ کیا۔ خواجہ صاحب صاف ستھرے لباس میں اجلے تن من کے ساتھ ہمیں نظم پڑھاتے...... مجید امجد کی تہہ در تہہ نظموں کا مفہوم سمجھاتے۔ اقبال کی نظموں کی تفہیم بتاتے۔ درمیانہ قد، من کی نفاست گوری رنگت پر عیاں۔ نہ کوئی جانب داری، نہ کسی سیاست سے کوئی تعلق۔ بے ضرر سی شخصیت، ٹھنڈی ٹھار طبیعت۔ ہم نے کبھی انھیں غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ ہمیشہ صاف شفاف رواں اور سبک چلنے والی ندی کی طرح دھیرے دھیرے چلتے کلاس میں آتے...... اور ہمیں پڑھانے میں مصروف ہو جاتے۔ میں نے اُن کی کلاس میں بیٹھ کر بار ہا ریڈیو کے ''یونیورسٹی پروگرام'' کے لیے افسانے بھی لکھے مگر مجال ہے جو انھیں خبر ہوئی ہو......

استاد سے شاگرد کا رشتہ ہی کچھ خاص ہوتا ہے۔ احترام کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں ہاتھ

پاؤں مارتے ہوئے جیسے کوئی تیراک دوانتہاؤں میں سانس لیتا ہے۔

پچھلے چالیس سالوں میں میری اُن سے صرف ایک بار ہی ملاقات ہوئی تھی...... اور اِس ملاقات کے لیے مجھے اپنا کلاس فیلو اور دوست شبیہ الحسن بھی یاد آ رہا تھا...... جسے نادیدہ ہاتھوں نے قتل کر ڈالا تھا...... نہ جانے کون لوگ تھے۔ جنھوں نے اتنی مہذب شائستہ اور محبت کرنے والی ہستی کو مٹا دیا۔ کیا ملا ہوگا انھیں!

کسی ناگفتہ، ناآسودہ خواہشات کی تسکین......

شبیہ الحسن تو رزقِ حلال کمانے والا مڈل کلاس شاعر تھا...... ایک ادبی رسالہ طلوعِ سحر کی عرق ریزی میں ہمہ تن مصروف رہتا تھا۔

اپنا ایک کالج بھی چلا رہا تھا۔ کئی کتابوں کا مصنف اور سچا عاشق حسین تھا......

وہ ایک اچھا دوست بھی تھا۔ میں جب بھی لاہور جاتی، اُس سے ملاقات ضرور ہوتی۔ وہ میرا بے ادبی کا زمانہ تھا۔ لہٰذا اپنے ادبی دوستوں سے ملاقات ہی میرے وہ خوش گوار لمحات تھے۔ جسے سمیٹ کر میں اپنے خشک اور بنجر راستوں کو منور کیا کرتی تھی......

اُس نے ہی مجھے مجبور کیا...... اور لکھنے پر مائل اور قائل کیا۔ ایک دفعہ میں نے لاہور پہنچ کر شبیہ الحسن کو فون کیا تو کہنے لگا: نعیم، جوہر ٹاؤن کے بوائز کالج میں آ جاؤ۔ یہاں آج کل کتابوں کی نمائش لگی ہوئی ہے، وہ بھی دیکھیں گے اور اگر چاہو تو تم کچھ کتابیں بھی خرید لینا۔ میں وہاں پہنچی تو شبیہ میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ اپنے بہت سے ساتھیوں سے مجھے ملوایا۔ کتابوں کی نمائش دکھائی اور کُچھ کتابیں تحفے میں دیں۔ میں نے اجازت چاہی تو خواجہ ذکریا صاحب تشریف لے آئے...... انھیں دیکھ کر میں تو خوشی سے نہال ہوگئی۔ شبیہ نے مجھ سے گاڑی کی چابی مانگی۔ گاڑی میں رکھی کتابیں واپس منگوائیں۔ میں حیران تھی کہ وہ یہ سب کیوں کر رہا ہے۔ بارہا پوچھا مگر ٹال گیا......

کچھ دیر بعد اُس نے وہ کتابیں مجھے خواجہ ذکریا کے ہاتھ سے دلوائیں اور تصویریں بھی بنائیں...... میں خوشی خوشی وہ کتابیں لے کر گاڑی میں آئی تو سیٹ پر جوس اور کھانے کی کچھ چیزیں پڑی تھیں۔ نہ جانے کس وقت شبیہ نے وہ رکھوا دیں تھیں۔ اب وہ اِس دنیا میں نہیں...... مگر دوستی کی خوشبو میرے اردگرد یونہی مہک رہی ہے، تو پھر جاوداں خوشیاں تو دوستوں کی مہکتی یادوں کے ساتھ ہی

لپٹی ہوئی ہیں نا۔

اس کتاب کی تمام تحریریں میں نے بہت مزے میں لکھی ہیں...... بعض دوستوں نے خبردار کیا...... مت چھپواؤ، تنہا ہو جاؤ گی...... سچ بولنا بہت مشکل کام ہے...... ایسے میں ایک سلمیٰ اعوان ہی تھیں جنھوں نے مجھے بیچ چوراہے للکارا...... نعیم لکھنا ہے تو سچ لکھو، وگرنہ مت لکھو اور اگر لکھو تو چھپواؤ...... اگر پتھر برسیں تو سمجھو تحریر میں دم ہے...... میری دوستوں کی محبتیں سلامت رہیں۔ وہ کبھی میرا قلم بن جاتی ہیں، کبھی روشنائی اور کبھی الفاظ کی وہ طاقت جو عصا تھامے میرے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ اب جس کے اردگرد شہلا حسن زیدی اور سلمیٰ اعوان جیسی دبنگ شخصیتیں ہوں وہ اپنی خوش قسمتی پر کیوں نہ ناز کرے...... بہر حال اس کتاب کو میں نے ایک خاص مقام تک لا کر مصلحتاً ختم کر دیا ہے۔ پتھر برسنے والے حصے کو فسادِ خلقِ خدا کی وجہ سے مؤخر کر دیا ہے۔ اس سے اگلا حصہ زندگی نے مہلت دی تو پھر کبھی پیش کروں گی......

ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

دو ہزار بیس کا سورج طلوع ہونے سے قبل ہی دنیا کے ایک سرے سے کورونا کی وبا سر اُٹھا چکی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ دنیا کے تمام خطے اور ان خطوں میں بسنے والے انسان اس موذی مرض کا شکار ہونا شروع ہوئے۔ وبا حد سے بڑھی تو خوف بھی حدوں سے تجاوز کر گیا۔ لوگ اپنے گھروں میں محصور ہو گئے۔ تنہائی، نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی خلفشار کے باعث اعصاب شل ہونے لگے تو قلم کے سپاہی فکر کے محاذ پر ڈٹ گئے۔ شعر، نظمیں اور افسانے تخلیق ہونے لگے۔ گھروں کے دریچوں سے باہر کی فضا کا نظارہ ہونے لگا۔ خارج نے باطن کی طرف سفر کیا اور سوچ کے اس امتیاز سے ایسا ادب تخلیق ہوا جس سے دنیا آشنا نہ تھی۔ اسلام آباد کے ایک سیکٹر آئی ایٹ فور کی ایک گلی میں ایک خوشنما چھت والے مکان سے بھی ایک ایسا دریچہ کھلا۔ اس دریچے کے باہر ہر جہان جہان دیگر تھا۔ اس دریچے سے جھانکنے والی آنکھ نعیم فاطمہ علوی کی تھی۔ متجسس، متحرک اور مشتاق دید۔

نعیم فاطمہ کی تحاریر کو ان کی شخصیت سے الگ کر کے سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ جو دردمندی، انسانی ہمدردی، اشتیاق، جدت، فکری ترفع اور سادگی ان کے لکھے ہوئے حروف میں ہے۔ ان کی شخصیت میں یہ تمام عناصر پوری توانائی سے جگمگا رہے ہیں۔ سوچ کا قافلہ کبھی رکتا نہیں۔ جب قافلہ سالار شوق ہو تو مسافر منزلوں پر منزلیں مارتا آگے ہی آگے بڑھتا رہتا ہے۔ نعیم فاطمہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وبا نے ماحول کو جکڑ لیا تو ان کی سوچ نے پنکھ پھیلا لیے اور پھر ایسی اڈاری بھری کہ دیکھنے والی آنکھیں مبہوت ہو گئیں۔ سماج، سیاست، ادب، معاشرت، منظر نگاری...... اس دریچے سے جھانکتی آنکھ نے ہمیں ہر منظر دکھا دیا۔ مجھے نعیم فاطمہ کی تحاریر پڑھتے ہوئے بار بار این فرینک کی وہ ڈائری یاد آتی رہی جو اس نے جرمنی کے ایک اپارٹمنٹ کی ایک کھلی کھڑکی کے پیچھے بیٹھ کر لکھی تھی۔ اس ڈائری میں رقم ہونے والے مناظر تو کھڑکی سے باہر کے تھے لیکن تنہائی، خوف اور اداسی کے عفریت کھڑکی کے اندر اس اکیلی لڑکی کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھے۔ نعیم فاطمہ بھی اپنی نوع کی این فرینک ہے۔ این فرینک سیاسی جبر کی شکار تھی اور نعیم فاطمہ کو وبا نے کھڑکی کے

پیچھے دھکیل رکھا تھا۔ آیے! خارج سے باطن کے اس سفر کے چند پڑاؤ دیکھیں۔

کہیں مسز موعود ہیں۔ گوری چٹی بالوں میں چاندی کی کرنیں سمیٹے شخصیت میں سلجھاؤ اور گفتگو میں توازن، چمکتی آنکھوں میں واضح اور روشن منزل گرل گائیڈ کی رسی تھامے آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس سے آگے نہ کسی شے کی تمنا ہے اور نہ حسرت...... کبھی یہ کھڑکی دلکشی اور رعنائی کی کتھا سناتے اٹک خورد کے خوبرو ریلوے سٹیشن پر جا کھلتی ہے۔ دریا کنارے بنا یہ بانکا سا ریلوے سٹیشن تنہا اور اداس کھڑا ہے۔ اب یہاں کوئی ریل نہیں رکتی۔ شاید وقت اسے اس وادی میں رکھ کر بھول گیا ہے۔ سوچ کا سفر ماضی کی گزرگاہوں سے بھی ہو کر گزرتا ہے۔ جب نعیم فاطمہ کا مکان تعمیر کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ ہمیں قریب بسنے والے خانہ بدوشوں کی زندگی کی بھی ایک جھلک ملتی ہے۔ جو دنیا کی تیز رفتاری سے منہ موڑے اپنی پسندیدہ رفتار سے چلتے چلے جا رہے ہیں۔ چلتے جا رہے ہیں اور زندگی کا مفہوم سمجھا رہے ہیں۔ یہیں کہیں کھلے آسمان تلے سویا شیر خان ہے جس کے پاس رہنے کو جگہ نہیں لیکن زبان پر نہ حرف شکایت ہے اور نہ ہی کچھ طلب کرنے کی خواہش...... دردمند اور حساس قلم کار اسے اپنے گھر میں ایک کمرہ دے کر وہ سکون حاصل کر لیتی ہے جو بہت سے لوگوں کو ڈیپریشن کی گولیاں کھا کر بھی نہیں ملتا۔

اس طرح کے بے شمار مناظر ہیں جو آنکھ کی پتلی پر نقش ہیں۔ آرگینزا کے پردوں سے چھن کر کمرے میں داخل ہوتی دھوپ اور گلی میں چھٹکی ہوئی چاندنی، دونوں نے ایک جیسا پیرہن اوڑھ لیا ہے۔ کورونا نامی وبا نے دنیا کا رخ ہی موڑ دیا ہے۔ سب اپنی جگہ ہے مگر مختلف ہے۔ اس سب مختلف میں ہماری این فرینک کی ڈائری سب سے مختلف ہے۔ جیسے اماوس کی رات میں تاروں کی بارات، جیسے جھلساتی دھوپ میں برگد کی گھنی چھاؤں، جیسے حبس کے موسم میں برکھا میں بھیگی ہوا، جیسے برفیلے دن میں مہربان پیلی دھوپ اور جیسے زمستانی زمانوں میں نرم و گرم لحاف کی دلنواز حدت......

وبا ختم نہیں ہوئی لیکن یہ کھڑکی ابھی کھلی ہے۔ خدا کرے کہ یہ کھڑکی یونہی کھلی رہے اور ہم ہفت رنگ مناظر دیکھتے رہیں......

سلمان باسط

سگھڑ دیوی

مٹی کی محبت، ماضی کی یادیں اور خوشگوار تجربے، مصنف کو یقینی مسرت سے ہمکنار کرتے ہیں۔آس پاس کے رویے، احساسات وجذبات، محبت نفرت، حسد اور اخلاقی اوصاف سے مزین کردار عام زندگی میں ہمیشہ متاثر کرتے ہیں۔انھی میں بعض کردار اپنا ان مٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔نعیم فاطمہ علوی کو اللہ نے وہ نظر عطا کی ہے جو گہرائی میں اتر کر نتائج اخذ کر لیتی ہے۔اس کا مشاہدہ گہرا اور دل شدتِ احساس سے معمور ہے۔

گزشتہ چند مہینوں میں ہم سب لاک ڈاؤن میں بند ہیں۔لوگ خوف تنہائی کے لا علاج مرض میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں۔ ہزاروں صفحات لکھنے والے بھی خاموش ہیں۔ایسے میں اگر کوئی اپنی تخلیق پیش کرے تو۔۔۔جی اُٹھتے ہیں۔ ایسے سناٹے میں نعیم فاطمہ علوی کے اندر کی آوازیں، برسوں کی رُکی باتیں اس کے اندر مچلنے لگیں تو، ان آوازوں کا شور سن کر وہ ماضی کے سمندر میں اُتر گئی اور اپنی یادوں کے دریچے کھولے کھڑکی کے اس پار دیکھنے لگی۔

یادوں کا کیا ہے وہ کسی وقت بھی حملہ آور ہو سکتی ہیں۔جس طرح موسموں کے اثرات مختلف احساسات کو جنم دیتے ہیں اور انسان کو کسی دوسری دنیا میں لے جاتے ہیں، اسی طرح کچھ آوازیں انسان کو ماضی کے کسی دریچے کے سامنے لا کھڑا کرتی ہیں۔ یادیں صرف یادیں نہیں بلکہ زندگی کا اثاثہ ہوتی ہیں۔

ماضی کی دیوار پر لگی وہ خوبصورت یادیں...... وہ بیتے ہوئے لمحات اس کے دل میں جب خوشبو کی طرح مہکنے لگے اور کرنوں کی طرح چمکنے لگے تو اس نے اپنے شعور اور لاشعور میں ان گونجتی آوازوں کو لفظوں کے ذریعے کاغذوں پر منتقل کرنا شروع کر دیا۔

سنہری یادوں کے اُجالے میں ہر منظر دلفریب اور خوشگوار یادوں کے ساتھ چمک رہا تھا......زندگی خوبصورت ہے مگراس کی خوبصورتی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب یہ گزر جاتی ہے۔ محبت، زندگی اور موت جیسے واقعات خوبصورت جملوں میں اس کی تحریر میں سجے ہوئے ہیں۔ لمحے خوشی کے ہوں یا غم کے انسانی زندگی پر اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ انسان لاکھ بھلانا چاہے بھی تو بھلا نہیں پاتا لیکن نعیم فاطمہ علوی نے ایسے لمحوں کو بھی یادوں کا روپ دے کر ایک زندہ حقیقت بنا دیا ہے۔ اس کے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں پوشیدہ جو خوشی اور غم کا فلسفہ ہے وہ اس کے دل کی آواز ہے۔

اپنی زندگی کے ذاتی مشاہدے کو بنیاد بناتے ہوئے معاشرے کے تضادات، منافقتوں اور خود غرضیوں کو کئی پہلوؤں سے دیکھ کر اپنے عہد، ماحول اور فنا کو اپنی تحریروں میں پوری طرح جذب کیا ہے اور اس کی یادداشتیں اپنے اندر بے پناہ دلکشی لیے ہوئے ہیں۔

نعیم فاطمہ سے میری پہلی ملاقات اکیڈمی میں ہوئی......وہ مجھے بہت ٹیلنٹڈ لگی۔ دل نے کہا: یہ دوستی چلے گی۔ یہ آدم ذات بھی عجیب ہوتی ہے، جب زندگی سے روٹھے بہت دن گزر جائیں تو دل بہانے ڈھونڈتا ہے۔ یہی حال تھا میرا ان دنوں...... کچھ ہی دنوں بعد میری اس سے دوسری ملاقات اس کے گھر میں ہوئی...... بڑی پڑھی لکھی، بے حد کلچرڈ، اچھی خاصی شان بے نیازی کی مالک، یہ اس کے رکھ رکھاؤ کا ایک حصہ تھا۔ دو ہی ملاقاتوں میں مجھے یوں لگا جیسے ہمارے درمیان اجنبیت نام کی کوئی شے موجود ہی نہیں تھی، بے پناہ اپنائیت!

اس کے ڈرائنگ روم میں پودینے کی چٹنی اور سلاد کی مہک الگ آواز دیتی ہے اور وہ خود صاف ستھری میز پر سلیقے سے کھانا سجائے سگھڑ دیوی سی لگتی ہے۔ کھانے کے بغیر کبھی نہیں آنے دیتی۔

اس کی شخصیت کا دوسرا پہلو یہ ہے......محبت اس کے خمیر میں ہے۔ خوش اخلاق ہے، ملنسار ہے۔ بہت نفیس اور مہمان نواز......اس کے الفاظ کی نرمی اور لہجے کی شیرینی اس کی گواہ ہے۔

بے حد حساس طبیعت کی مالک ہے۔ زندگی کے مختلف رویوں اور تلخیوں کو اپنے اندر جذب کر

لیتی ہے۔ ہر کسی کا دکھ، تکلیف جو اس کی نظروں سے گزرے وہ فوراً متاثر ہو جاتی ہے۔ اس کی شخصیت میں بھلائی کا جذبہ ہے۔ میری دعا ہے یہ گداز جذبہ رکھنے والی اس طرح ہنستی مسکراتی رہے اور کامیابیوں کے ساتھ مسکراہٹیں بکھیرتی رہے۔

ان دنوں وہ اپنی کھڑکی، روشن دان اور گلی کے سائے میں اپنی یادوں سے دل بہلاتی ہے۔ کیونکہ یادیں اور خواب انسانی زندگی کی متاع ہیں جنھیں ہم اپنے سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ جن کی خوشبو وجود اور روح کو مہکائے رکھتی ہے اور جینے کا حوصلہ دیتی ہے۔

منیرہ شمیم

علوی گھرانے کا ادبی چشم و چراغ......نعیم فاطمہ علوی

نعیم فاطمہ علوی کا نام پہلی مرتبہ سنا تو بہت خوشی ہوئی۔ مستنصر حسین تارڑ، انعام الحق جاوید، عقیل عباس جعفری اور عائشہ مسعود ملک جیسے سہ حرفی ناموں میں یہ ایک اور اضافہ تھا۔

نعیم فاطمہ علوی کے نام کی اس خصوصیت کے علاوہ بھی کچھ خصوصیات ہیں......جن دنوں ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی ان دنوں ہماری ایک مشترکہ دوست نے ہمارے گھر سے ہو کر ان کی طرف جانا تھا۔ انھوں نے بے چینی اور جلدی میں ایک سے زائد مرتبہ یہ الفاظ دہرائے۔ مجھے نعیم سے بہت ضروری ملنا ہے۔ مجھے جلدی جانا ہے۔ میں نے نعیم کو وقت دیا ہوا ہے۔

ہم نے ان کی ''ففٹی پلس'' کی عمر میں گلابی میچنگ کو ان کی ہنر مندی کی بجائے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ پھر یہ سوچ کر کندھے اچک لیے کہ عشق و محبت کے لیے عمر کی کوئی قید تو نہیں ہوتی۔ ابھی حال ہی میں ثمینہ احمد، بشریٰ انصاری اور انجمن نے ہی اس کام کی مثالیں قائم کی ہیں۔ لہٰذا ان کو چائے پیے بغیر ہی جانے کی اجازت دے دی۔

لیکن ایک مرتبہ تو حد ہوگئی جب انھوں نے کہا کہ چلو تم بھی نعیم سے ملنے چلو......لیکن ہمارے تاثرات دیکھ کر بولیں......ایک بار جاؤ گی تو پھر بار بار جاؤ گی۔ ہم نے فوراً ہی معذرت کر دی اور یہ غلط فہمی اس وقت تک برقرار رہی جب تک ان کی زبانی نعیم فاطمہ علوی کا پورا نام نہیں سن لیا تھا۔

نعیم فاطمہ علوی کے گھر منعقدہ تقریبات میں مدعوئین میں گھبراہٹ کی وجہ ہمیں بھی بہت جلد ہمیں معلوم ہوگئی کہ جب ہم بھی مدعوئین میں شامل ہوئے اور مدعو کیے گئے اور یہ گھبراہٹ ہم پر بھی طاری ہوئی کیونکہ یہ وقت کی اتنی پابند ہیں کہ کوئی آئے یا نہ آئے یہ پروگرام شروع کر لیتی ہیں۔ حتیٰ کہ مہمانوں کے دیر سے آنے پر یوں بھی ہو سکتا ہے کہ یہ پروگرام کا آغاز کریں۔ نظامت

کریں، اپنا افسانہ پڑھیں اور پروگرام کا تن تنہا اختتام کر کے رپورٹ لکھ کر نیٹ کے حلقہ میں شیئر کر دیں۔ لہٰذا تقریب کے شرکاء کا اعزاز حاصل کرنے والوں کو یہ یاد رکھنا ہوگا کہ جس دن نعیم فاطمہ علوی کی طرف سے تقریب میں شرکت کی دعوت ہو اس دن صبح سویرے ہی نہا دھو کر تیار ہو جانے کی عادت ڈال لیں۔

نعیم فاطمہ علوی سے میری پہلی ملاقات ''الاقرباء'' کے مدیر منصور عاقل کی تقریب میں مضمون پڑھنے کی دعوت پر سرسید ہال میں ہوئی تھی۔ ہال کے استقبالی دروازے پر نازک سی سانولے پن سے ذرا کھلتے ہوئے رنگ والی اور خوبصورت ساڑھی میں ملبوس ایک ہندوستانی مہیلا نے ہمارا استقبال کیا۔

الاقرباء چونکہ انٹرنیشنل رسالہ ہے۔ لہٰذا دو ملکوں کے درمیان اچھے تعلقات کی یہ بنیاد ہمیں بڑی اچھی لگی اور ہم نے ہندوستان کے بارے میں اپنے سارے نظریات کو پسِ پشت ڈال کر کشور ناہید کو یاد کیا اور محض معانقہ سے بڑھ کر اس مہیلا کو گرمجوشی سے گلے لگالیا۔ جواباً خاموشی کی زبان میں ہمیں بھی اتنی ہی گرمجوشی ملی تو سوچا چلو دو حکومتوں کے درمیان اچھے تعلقات کا آغاز تو ہوا اور پھر یہ بھی سوچا کہ شاید اس طرح مسئلہ کشمیر کے حل ہونے کی بھی کوئی صورت نکل آئے۔

پروگرام کا آغاز ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ نعیم فاطمہ علوی ہیں اور پروگرام کی ناظمہ بھی ہیں مگر ہمارا غلط فہمی میں کیا گیا ان کے ساتھ گرمجوشی اور محبت کا آغاز آج بھی ویسا ہی قائم ودائم ہے۔

اس دن کی تقریب میں ہمیں ایک اور طرح کی خوشی بھی ہوئی اور وہ یہ تھی کہ اکادمی ادبیات میں برسوں سے سننے والی ''نظامتوں'' کے گلے شکوے بھی دور ہو گئے۔ کیونکہ نعیم فاطمہ علوی نے اسٹیج پر خوامخواہ کی اپنی موجودگی بڑھائے رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور نپے تلے انداز میں تقریب کو احسن طریقے سے آگے بڑھایا اور یہ رویہ ان کے گھر کی تقریب میں بھی برقرار رہتا ہے۔ حالانکہ کہتے ہیں کہ اپنے گھر میں بلی بھی شیر ہوتی ہے۔

راز کی بات یہ ہے کہ نعیم فاطمہ علوی نے اس قسم کا معیار یونہی برقرار نہیں رکھا ہوا اس سلسلے میں وہ پوری تیاری کرتی ہیں۔ کچھ خواتین ان کی اس عادت کو ''چالاکی'' کا نام بھی دیتی ہیں۔ کیونکہ اتنے پرفیکٹ انداز میں پروگرام کا اہتمام کر کے تقریب کو اختتام کے ساتھ لے جانے کے لیے کسی کو یہ

خیال ہی نہیں آتا کہ کوئی اور بھی یہ کام کرسکتا ہے۔ یہ انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ بیٹھتی ہیں۔

نعیم فاطمہ علوی سیلانی مزاج کی ہیں سیر وسیاحت کی شوقین ہیں اور یہ دائرہ ملکی سیاحت سے نکل کر بین الاقوامی سیاحت تک پہنچا ہوا ہے۔ گھومنے پھرنے کی شوق کی وجہ سے انھیں اسلام آباد کی سلمٰی اعوان بھی کہا جا سکتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ سیاحت کے علاوہ انھیں موسیقی سے بھی خاصی دلچسپی ہے۔ لوک ورثہ کو منافع بخش ادارہ بنانے میں بھی ان کی خدمات شامل ہیں۔ کئی برس تک انھوں نے ''سرِ عام'' کھلے میدان میں موسیقی کے بے شمار پروگرام منعقد کیے جن سے عوام لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ موسیقی کے پروگراموں کا سلسلہ دراز ہو کر ان کے گھر سے ہوتا ہوا میدانوں پہاڑوں پارکوں حتیٰ کہ ریلوے اسٹیشن تک جا پہنچا۔ کورونا وبا کا افتتاحی دن بھی ہم نے کوئی فیتہ کاٹے بغیر ان کے ساتھ گولڑہ ریلوے اسٹیشن پر گزارا اور دنیا میں نئی متعارف ہونے والی وبا کے ہلکے ہلکے خوف سے دھیرے دھیرے چڑھتے ہوئے اثر کے ساتھ ایک لوک فنکار تیمور افغانی سے ہیر بھی سنی تھی۔ مزا تو بہت آیا تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہیر اور ریلوے اسٹیشن کا تعلق ہمیں آج تک سمجھ نہیں آیا۔

دوستو دنیا میں وبا کا موسم جاری وساری ہے۔ ذرا یہ کم ہو تو ہم میں سے کسی کو معلوم نہیں کہ ہمیں ان کے ساتھ کہاں جانا ہوگا۔ بہر حال یہ جو بھی فیصلہ کریں گی سب کو قبول ہوگا۔ کوئی چ ہے تو ابھی تصدیق کروالے۔ سب کے سب تین مرتبہ ہاں بول دیں گے مگر یہ بات ہم نعیم فاطمہ علوی سے پوچھ نہیں سکیں گے کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ کیونکہ ان کی خوبیوں کے آگے ہم نے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور اس نہ پوچھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کم بجٹ میں ایسی تقریب کا اہتمام کرتی ہیں کہ جس میں ''فائیو سٹار'' والی ساری خصوصیات موجود ہوتی ہیں تو پھر کون کافر سوال کرنے کا سوچے گا بھی۔ ویسے ہمیں یہ شک بھی ہے کہ ان کے پاس کوئی نہ کوئی گیدڑ سنگھی ضرور موجود ہے۔ کیونکہ شہر کے بڑے بڑے لکھاری رام ہو کر ان کے سامنے رام رام کرتے ہیں اور یہ وزیرِ اعظم عمران خان کی نالائقی ہے کہ وہ اپنی ٹیم کو سیدھے راستے پر نہیں لا سکا۔

کورونا کی وبا میں سمارٹ لاک ڈاؤن کا فائدہ نعیم فاطمہ علوی نے خوب اُٹھایا......اور گھر کے اندر ایک کھڑکی کھلی رکھی۔ جہاں سے یہ اپنی یادوں کے دریچے کھول دیتی تھیں اور اپنی یادداشتیں لکھا

کرتی تھیں اور سب دوستوں سے شیئر بھی کرتی تھیں۔ یوں ہم سب ان کی تحریر سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ہمیں ان کی ذاتی زندگی کے اتار چڑھاؤ کا علم ہوتا تھا۔ یہ ان کی تحریر کا جادو ہے کہ بعض مقامات پر ہماری آنکھوں سے بارش برسنے کے آثار بھی نمایاں ہو جاتے تھے۔ خاص طور پر ان کی والدہ کی ان کے گھر میں آمد اور پھر رخصتی کا منظر خاصا دلگداز تھا اور پھر ساس صاحبہ کی صحت کی خرابی میں گزارے گئے دنوں کی مشکلات میں بعض محلے دار خواتین کا رویہ بھی تکلیف دہ تھا۔ ان واقعات میں نعیم فاطمہ علوی کے ساتھ گزرنا ایک الگ طرح کی کیفیت ہوا کرتی تھی مگر انھوں نے یہ ظلم کیا کہ ہمیں اپنی غمی خوشی کے ساتھ ساتھ اپنے پورے محلے کے دکھوں میں بھی مبتلا کر دیا۔

نعیم فاطمہ علوی نے پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹرز کیا وہاں کے اخبار جامعہ کے ساتھ منسلک رہیں۔ ان کا ریڈیو پر بھی آنا جانا تھا۔ ان کی صلاحیتوں کے یقیناً بہت سارے لوگ معترف بھی ہوں گے......ان کے یونیورسٹی کے تعلیمی مدارج میں اچھا سٹوڈنٹ ہونا، ادبی ہونا، پھڈے باز ہونا وغیرہ وغیرہ شامل ہوسکتا ہے مگر اس سارے عرصے میں کسی رومانس کا کوئی امکان نہیں تھا۔ کیونکہ ان کے بھائی بھی ان کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی میں ہی فزکس ڈیپارٹمنٹ میں تھے اور اتنا خشک مضمون پڑھنے والے بھائی کے ساتھ ادبی مزاج کی بہن پوری حفاظت میں تھی اور کسی کی کیا مجال تھی کہ وہاں بانو قدسیہ اور اشفاق احمد جیسی کوئی کہانی جنم لیتی۔ لہٰذا ایوب علوی خوش نصیب ٹھہرے اور نعیم فاطمہ علوی فزکس پڑھنے والے بھائی کے حصارِ حفاظت اور ماں باپ کی دعاؤں کے ساتھ رخصت ہو کر ان کے پاس آ گئیں۔

چونکہ نعیم فاطمہ علوی محض گھر کی چند تقریبات کی ناظمہ نہیں ہیں بلکہ پاکستان فیڈریشن آف یونیورسٹی ویمن کے تمام پروگراموں کا انتظام اور نظامت بھی کرتی ہیں وہاں بھی ہم نے دیکھا کہ پی ایچ ڈی سکالر لیڈیز ان کے اشاروں پر ناچتی ہیں اور وقت پر تقریب ختم کرنے کی پابندی میں ان کے کہنے کے مطابق تقریب شروع کرتی ہیں اور پھر ان کے اشارے پر ختم کر دیتی ہیں۔

یونیورسٹی ویمن کی پریزیڈنٹ قیصرہ مختار علوی مطمئن ہو کر سارا پروگرام ان کے حوالے کر دیتی ہیں۔ کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ تقریب کو منظّم انداز میں ان سے بہتر کوئی نہیں چلا سکتا۔ اب جہاں یونیورسٹی ویمن کی خواتین ان کی پابند ہو جاتی ہیں تو پھر فاسٹ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی کیا مجال

ہے کہ وہ اس کی پابندی نہ کرے۔

نعیم فاطمہ علوی کا آبائی تعلق فیصل آباد اور لاہور سے ہے ان کے شوہر ایوب علوی واہ کینٹ سے ہیں۔ فیصل آباد تا واہ کینٹ کا یہ تعلق کیسے بنا یہ ہمیں معلوم نہیں کیونکہ واہ کے تعلیمی ماحول کا فیصل آباد کی جگت بازی سے بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا مگر یہ فیصلہ دو خاندانوں نے کیا تھا لہٰذا یہ انہونی بھی ہو کر رہی۔

نعیم فاطمہ علوی کے دبنگ ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ دو بھائیوں کی اکلوتی بہن ہیں اور کہتے ہیں کہ اکلوتی بہن میں کئی بگاڑ آجاتے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ نعیم فاطمہ علوی میں اس حوالے سے کوئی بگاڑ ہے بھی تو وہ آٹے میں نمک کے برابر ہوگا۔ البتہ ہماری مقرر کردہ آٹے میں نمک کی مقدار سے ایوب علوی کو اختلاف ہو سکتا ہے۔

سنا تو یہی ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے مگر کامیاب عورت بغیر کسی ہاتھ کے کیسے کامیاب ہو جاتی ہے جتنی نعیم فاطمہ علوی ہیں کہ آج وہ شہر کی بھی پہچان ہیں اور شوہر کی بھی۔

نعیم فاطمہ علوی دراصل ''زونگ'' کے اس پیکیج کی طرح ہیں جس میں کالز کی سہولت کے علاوہ مفت منٹ بھی ملتے ہیں۔

نعیم فاطمہ علوی کی گھر کی تقریبات میں خلوص، محبت، مہمان نوازی کے ساتھ ساتھ انواع و اقسام کے خورد و نوش کی اشیاء اسی پیکج کی طرح ہیں جو مفت منٹ میں ساتھ ملتے ہیں۔ ان کھانے پینے کی اشیاء میں نثر پارے اور شاعری کے علاوہ کبھی کبھی کمرکس کے لڈو بھی ملتے ہیں جنھیں بہت سارے لوگ بڑے شوق سے کھا رہے ہوتے ہیں۔ ان کے لیے میں نے ایک شعر لکھا ہے

خدا آباد رکھے فاطمہ علوی تجھے ہر پل

اب اگلا مصرعہ ہمارے شاعر لوگوں کی اس مدد کے بعد لکھا جائے گا جب وہ علوی کے مزید قافیے ہمیں بتائیں گے۔

عائشہ مسعود

من موہنی صورت

نعیم فاطمہ علوی کا نام ذہن میں آتے ہی ہونٹوں پہ دل آویز مسکراہٹ سجائے سانولی سلونی اور من موہنی سی صورت روشن آنکھوں اور دمکتے چہرے کے ساتھ ہمارے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ نعیم فاطمہ علوی سے جب بھی ملاقات ہوئی باچھیں پھیلا کر اتنے پرتپاک طریقے سے ملیں جسے پنجابی میں کہتے ہیں ''کھلے متھے نال'' میں نے ہر ملاقات پر ان کے چہرے پر لکھا دیکھا کہ ''چشم ما روشن دل ما شاد'' نعیم جس محبت اور جس خلوص کے ساتھ ملتی اور جس طرح وہ آنے والوں کی آؤ بھگت کرتی ہیں...... ایسے پُر خلوص اور محبت سے بھرے رویے رکھنے والے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ مجھے ان سے مل کر ہمیشہ محسوس ہوا جیسے ان سے میری برسوں کی جان پہچان ہے۔

آج کل نفسا نفسی اور خود غرضی کا دور ہے اور ہم اتنے سہل پسند ہو گئے ہیں کہ کسی دوسرے کے لیے اپنے معمولات میں کسی معمولی تبدیلی کو نہ برداشت کرتے ہیں نہ گوارا کرتے ہیں اور نہ ہی اس کا اہتمام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنی زندگی اپنے طور پر گزارنا چاہتے ہیں اپنی مرضی کے مطابق اور اپنے ہی اردگرد گھومتے ہیں۔ ایسے لوگ مہمان تو بننا پسند کرتے ہیں مگر میزبانی انھیں کبھی اچھی نہیں لگتی۔

نعیم کو میں نے بیشتر اوقات میزبان کے روپ میں دیکھا...... کھانے کا ٹائم ہو تو کھانا اور چائے کا وقت ہو تو چائے۔ بڑی محبت اور چاہت سے سب کچھ اپنے ہاتھ سے بناتی ہیں اور مہمان کی بجائے میزبان بن کر زیادہ مسرور اور پُر مسرت دکھائی دیتی ہیں...... وہ بہت ہی پیار اور محبت کے ساتھ آؤ بھگت کرتی ہیں۔ یہ ایک بہت ہی خوبصورت جذبہ ہے اور ہمیں ایسے جذبے رکھنے والے لوگوں کی قدر کرنی چاہیے۔

نعیم کی خوبیوں میں ایک بڑی خوبی دردمند دل ہے، وہ درد سے بھرا ہوا دل رکھتی ہیں۔ کسی

نے ان کو اپنی تکلیف سنا دی تو پھر یہ نعیم کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اس کی تکلیف کو اس تک رہنے دیں، بلکہ وہ اس کی تکلیف اس کی پریشانی اس کی مصیبت کو اپنی ذات میں اتار لیتی ہیں اور پھر جسے کہتے ہیں نا! ''دامے درمے سخنے'' اس کی مدد اور اس کی دل جوئی کے لیے کمر بستہ ہو جاتی ہیں۔ جتنی مدد خود کر سکتی ہیں خود کرتی ہیں اور پھر اپنے اردگرد کے احباب کو بھی اس کی ضرورت پورا کرنے کے لیے آمادہ کرتی ہیں۔ ہے نا حیرت کی بات......

آج کل تو لوگ اپنی ذات سے بالاتر ہو کر سوچتے ہی نہیں وہ اپنے تعلقات کو بھی سنبھال سنبھال کر رکھتے ہیں۔ یہ کتنا بڑا جذبہ اور غیر معمولی رویہ ہے......

بسا اوقات میں نے یہ بھی دیکھا ان کی اس کمزوری کا دوسروں نے فائدہ بھی اُٹھایا مگر وہ اس سے بے نیاز ہیں۔ وہ اپنی دھن میں مگن نیکی کی روش پر چلتی رہتی ہیں اور نیکی کی سب سے بڑی پہچان بھی یہی ہے کہ جس سے نیکی کی جائے اس سے کوئی توقع بھی نہ رکھیں اور اپنی دُھن میں اس کی مدد کرتے چلے جائیں۔

ایک جگہ میں نے پڑھا تھا:

The way to be happy is to make others happy

ہم خوشیاں بانٹیں گے تو خوشیاں لوٹ کر ہمارے پاس آئیں گی۔

نیکیاں بانجھ نہیں ہوتیں ان کی نسلیں پروان چڑھتی ہیں...... نعیم نے کہیں اس فارمولے کو اپنی زندگی میں اپنایا ہوا ہے۔ نیکیاں اور خوشیاں سمیٹتی بھی ہیں اور دل کھول کر بانٹتی بھی ہیں۔ بہت سے لوگ ان سے محبت کرتے ہیں ان کو ملنا ان سے رابطہ رکھنا پسند کرتے ہیں۔

زندگی میں وہ لوگ قابلِ ستائش اور قابلِ تقلید ہوا کرتے ہیں جو دکھ سکھ کے ساتھی ہوتے ہیں۔ آج کل اچھے وقت کے سب ساتھی بن جاتے ہیں اور بُرے وقت میں تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے...... نعیم اچھے بُرے وقت کی ساتھی ہیں۔

ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص آیا جس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جس نے تعارف کروایا کہ یہ میرا دوست ہے تو آپ نے پوچھا کیا آپ پر کوئی کڑا وقت آیا اور تم نے اس کو آزمایا؟ اس شخص نے کہا شکر الحمدللہ میرے اوپر کوئی بُرا وقت نہیں آیا اس لیے میں نے اسے آزمایا

بھی نہیں......آپ نے جواب دیا جب تم نے آزمایا نہیں تو دوستی کا دعویٰ نہ کرو۔ دوست وہ ہوتا ہے جو اچھے بُرے وقت کا ساتھی ہو......اور نعیم کڑے سے کڑے وقت میں بھی آپ کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑی ہوتی ہے۔

نعیم جھکی ہوئی ڈالی کی طرح ہے۔ جتنا اللہ تعالیٰ ان کو نوازتا ہے یہ جھکتی چلی جاتی ہے۔ انکساری ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ شفقت، محبت اور عجز و انکساری یہ سب ان کے شعار ہیں۔ میں سمجھتی ہوں آج کل کے دور میں ایسی ویلیو کے ساتھ بہت کم لوگ آپ کو معاشرے میں ملتے ہیں۔

نعیم کو قدرت نے بہت اعلیٰ دل و دماغ سے بھی نوازا ہے۔ دل کھلتا ہوا پھول ہے، ذہن روشن اور اس ذہن میں علم و آگہی کے چراغ جلتے ہیں۔

کتاب دوست ہے تمام تر مصروفیت کے باوجود مطالعے کے لیے وقت نکال لیتی ہے۔ مطالعہ وسیع ہے، مشاہدہ بھی بہت اچھا ہے اور سونے پر سہاگہ یہ کہ قدرت نے انھیں لکھنے کی بہت عمدہ صلاحیت بخشی ہے۔ وہ اپنے تجربات اور مشاہدات کو خوبصورت اور پُراثر تحریروں کے ذریعے اپنے اردگرد بسنے والے لوگوں تک پہنچاتی ہے اور وہ ذہن جس میں آگہی کے چراغ جلتے ہیں، اس سے اپنے آپ کو بھی اور اپنے اردگرد بسنے والوں کو بھی منور کرتی ہے۔ ان کی تحریریں زندگی کے قریب ہیں اور زندگی کی حقیقتوں پر مبنی ہیں۔

اللہ تعالیٰ انھیں صحت، لمبی زندگی، کامیابیاں اور کامرانیاں دے، زندگی کے تمام راستوں کو نیکیوں کے روشن چراغوں سے جگمگاتا رکھے۔ آمین!

تحریم ظفر

نعیم فاطمہ علوی کی حرف آرائی

''کھڑکی کے اس پار'' کے عنوان سے جو کتھائیں نعیم فاطمہ علوی کے قلم سے سپرد قرطاس کی گئی ہیں۔ وہ ناسٹلجیا اور حسیاتی مقناطیسیت کا big bang ہیں۔ نعیم فاطمہ علوی طبعاً ہی ایک ultra sensitive لیکھک ہیں۔ ان کے قلم سے لکھی ہوئی روشنیاں اپنی miniature سطح کی جھلک میں بھی یگانہ اور بے حد تیکھی ہیں۔ جو کچھ ان کے گرد و پیش میں ہو رہا ہے، اس کا جمالیاتی وحسیاتی اظہار دراصل ان کا مسئلہ ہے۔ وہ وقت کی زنجیر سے کسی بھی پل کی کڑی ignore نہیں کرنا چاہتیں۔ اپنے پراگندہ طبع احباب کا جو احوال انھوں نے رقم کیا ہے اسے آپ ایک طرح سے ان کی indirect autobiography بھی کہہ سکتے ہیں۔

مسز متین اور ان کی دیگر دو بہنوں سے اپنے مراسم کا احوال جو انھوں نے بیان کیا ہے اس کی خواندگی کے دوران میں بے حد بے چین رہا۔ کہیں کہیں میری آنکھیں بھی چھلک گئیں۔ اس واقعاتی کتھا میں مجھے واضح طور پر یہ محسوس ہوا کہ اس کہانی کے تمام کردار نعیم فاطمہ علوی کے جیتے جی کبھی نہیں مر سکتے۔ نعیم صاحبہ نے انھیں اپنی یادداشتوں کا لفظی حصہ بنانے سے پیشتر انھیں اپنے احساس میں زندہ کر لیا تھا۔ جسمانی سطح پر نا موجود انسانوں کو اپنے احساس میں بالکل زندہ اور متحرک دکھانے کے بہت الگ قسم کے تجربات صرف بے پناہ تخلیقی تاب و تواں اور اعلیٰ تر حسیاتی سچائی رکھنے والے فنکاروں کے یہاں ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ covid کی پاکستان میں یلغار کے بالکل ابتدائی دنوں میں، میں انگریزی نظموں کو اردو میں منتقل کر رہا تھا۔

جن دنوں نعیم صاحبہ نے ان تینوں بہنوں کی کہانی روایت کی اسی دوران میں اعجاز رحیم کی انگریزی نظموں کے تراجم میں مشغول تھا۔ ان کی ایک انگریزی نظم again نے میری توجہ اپنی جانب کھینچ لی جس کا متن حیران کن حد تک نعیم صاحبہ کی کتھا کے مماثل تھا۔ مجھے لگا اعجاز صاحب اپنی

نظم again میں جس صاحبِ جوہر تخلیق کار کا ذکر کر رہے تھے وہ نعیم فاطمہ ہی تھیں۔ جنھوں نے تین بہنوں کو جو یکے بعد دیگرے ان کے حصار دوستی میں آئیں وہ جسمانی اعتبار سے expire ہو چکی تھیں۔ نعیم صاحبہ نے اپنی تخلیقی تاب سے انھیں زندہ کر لیا تھا اور اب جب تک نعیم سانس لیتی رہیں گی وہ تین بہنیں بھی پردۂ حیات پر متحرک رہیں گی......

اعجاز رحیم کی نظم Again کی کچھ لائنیں......

you expired amplied
Death non existance
in our lives
no one ever died
While u were alive
But with u gone
All those who went before
Have died once more

یہ تخلیقی سچائی اور حسیاتی جرأت کا ایک اعلیٰ سطح کا خلاقانہ اظہار ہے اور نعیم فاطمہ علوی پوری صداقت سے اس تجربے میں سرخرو نظر آتی ہیں۔ مسز متین کے حوالے سے کہانی کی ابتدا میں رقم طراز ہیں کہ اکثر کچھ نہ کچھ پکا کے پلیٹ میں سجا کر بھیجا کرتیں اور پلیٹ کے اوپر ایک شعر بھی لکھ کر دیتیں۔ چونکہ مسز متین لکھنؤ سے تھیں سو ان کی جنم بھومی آخری دم تک ان کے ساتھ جیتی جاگتی سانس لیتی رہی۔

نعیم فاطمہ صاحبہ نے متین صاحبہ کی بہن حفیظ سے بھی اپنی خاص قلبی نزدیکی کا بے مہابا اظہار کیا ہے۔

مسز متین کے بعد حفیظ سے میری دوستی ہوگئی، بڑی ورسٹائل خاتون تھیں۔ چار فٹ قد پر ایک خاص وضع قطع کی شخصیت سجی ہوئی تھی۔ ایک اعلیٰ درجے کا حسِ مزاح ان کے تعارف کا حصہ تھا۔

منہ سے مختلف جانوروں کی آوازیں نکالنا، ہر صوبے کا کلاسیکل ڈانس، یوگا، ڈھولکی، کوئی ایسا فن نہیں تھا جو انھیں نہ آتا ہو۔

سماجی تقریبات کی جان بن جانے کے تمام گُن حفیظ کی ذات میں پورے تھے۔ رقص ڈھولک خوش مقالی الغرض سب کچھ قدرت بے نیاز نے اس کی ذات میں رکھ دیا تھا۔

مسز متین نے لکھنؤ کی محبت میں جو یوٹو پیا تعمیر کیا تھا...... اس کی بے حد صراحت سے نشاندہی نعیم فاطمہ علوی نے اپنی کتھا کے آغاز میں کی ہے۔

نعیم کے مطابق وہ لکھنؤ کی محبت میں تادم آخر گرفتار رہیں۔ وہ فرماتی تھیں کہ وہاں کے چھابڑی فروش بھی شعر میں کلام کرتے تھے۔ لکھنؤ ان کے اندر تھا، جب جی چاہتا نکال کے باہر لے آتیں۔

نعیم فاطمہ ایک مبتلا روح ہیں جو کچھ لکھتی ہیں وہ دل کی تہوں سے لکھتی ہیں۔ ایک جگہ اپنی ماں جی کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ وہ میرے گھر میں جب بھی داخل ہوتیں...... گویا میرے لیے دعاؤں کی برکھا برسنے لگتی۔ ان کے مطابق even سن رسیدگی میں جب انھیں اپنی دعاؤں کی خود ضرورت تھی وہ یہ زرِ خاص میری دہلیز پر میرے نام لٹا دیتی تھیں۔

نعیم ایک ultra sensitive فنکار ہیں۔ انھوں نے ...... کھڑکی کے اُس پار...... کے عنوان سے اپنے چاروں طرف رونما ہونے والے واقعات کو بے حد اثر انگیز اسلوب تحریر میں پینٹ کیا ہے۔ ان کا بیانیہ ہمیشہ سے اچھوتا اور دلکش رہا ہے۔ جس واقعے کو جہاں سے سکیچ کرنا چاہیے وہ بالکل وہاں سے ہی اس کے لیے کلک کرتی ہیں۔ آپ بے حد اہم شارٹ سٹوری رائٹر ہیں...... travelogue میں آپ کی نثر نے کئی دلکش رنگ اپنے قارئین کو دکھائے۔

میں سمجھتا ہوں یہ کتاب...... انتہائی قیمتی ثابت ہوگی۔ گداز حسیاتی سچائیوں پر مشتمل واقعاتی کہانیاں معاصر اردو ادب کے نثری سیکشن میں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ یہ نثر پارے ایک بے حد مضطرب اور محبت میں پگھلی ہوئی روح کا عمیق تر اظہار ہیں۔

شہزاد اظہر

کورونائی ماحول

کھڑکی کے اس پار آرام دہ کمرہ...... کمرے کی دیواروں پر سجی بچوں کی تصویریں...... کچھ الٹ پلٹ ہوا فرنیچر...... لیپ ٹاپ...... آئی پیڈ...... آئی فون اور اس کے علاوہ زادِراہ کے طور پر دوستوں، خیر خواہوں کی امسال چھپنے والی چند کتابیں اور ان چند کتابوں کے علاوہ الماریوں میں سجی سیکڑوں کتابیں......

اسی کھڑکی کے اس پار دو کونوں میں الگ الگ لان چیئرز پر بیٹھے دو میاں بیوی سوچ رہے ہیں زندگی میں کبھی ایسا وقت نہیں آیا...... کہ دونوں کے پاس ساتھ ساتھ بیٹھنے کی بے پناہ فراغت ہو۔ شام کے ملگجے اندھیرے میں پرانے گانے سننے کے لیے وقت ہو...... باتیں کرنے کی چاہت ہو۔ خود کو کھوجنے کی فرصت ہو۔ صلاحیتوں کو آزمانے کی جستجو ہو...... وقت کو قید کر لینے کی ہمت ہو۔ سونے جاگنے پر اپنی مرضی ہو۔ تیار ہونے یا نہ ہونے کی آزادی ہو۔ ادھورے کام نبھانے کی سہولت ہو۔ مادی اشیا کی حقیقت آشکار ہوئی ہو۔ حقیقی رشتوں کی خوشبو سے آشنائی ہو۔ دل کے نہاں خانوں میں چھپی خواہشوں کو جان لینے کی دانائی ہو......

گھر کی دیواروں سے باہم گفت وشنید ہو۔ تصویروں سے مفہوم تلاش کرنے کی پرتیں کھلی ہوں۔ اشیا سے لطف اندوز ہونے کا سلیقہ ہو۔ زندگی کو آبشاروں کے گرنے اور گزرتے وقت کو پھولوں کے کھلنے سے سمجھنے کا موقع ملا ہو۔ ہواؤں میں پھیلی خوشبو کا عطر زندگی کو امر ہونا سکھا جائے۔

ان دونوں میں زندگی کی حرص تو نہیں مگر بے آرزو بھی نہیں......

زندگی میں نیا پن نہیں مگر حسین یادوں کا فقدان بھی نہیں...... بدن مضمحل ہے مگر بے حوصلہ نہیں۔

اعضا میں اعتدال نہیں مگر ایسے بے اختیار بھی نہیں۔ مقصدیت اور وقت کے مفید مصرف نے زندگی خوشبو سے بھر دی ہے۔

انسان کا جسم بھی کتنا زرخیز ہے۔ وہ اپنی کوکھ سے صرف اولاد کو ہی جنم نہیں دیتا...... خواہشوں، آرزوؤں، اناؤں اور تمام شیطانی خصلتوں کا بھی تو یہی خالق ہے۔

کپڑوں کی الماری میں بے انتہا کپڑے ہیں۔ خاتون الماری کھول کر کپڑوں کو دیکھتی ہے اور سوچتی ہے، ان کپڑوں میں سے کون سے پہنوں...... یہ کپڑے یہ ہار سنگھار یہ زیور سب چیزیں کرائے کی ہیں۔ زندگی کو گروی رکھ کر ان چیزوں کی وصولی سے کیسے لُطف اُٹھاؤں۔

گھر میں ہر طرح کی ضرورت کا سامان ہے، ہر طرح کے کھانوں کا ڈھیر ہے۔ آسائش اور ضرورت کی ہر چیز میسر ہے۔ دونوں کے لیے زندگی میں صرف دو ہی کام ہیں کھانا، سونا اور کُرسیاں بدل بدل کر بیٹھے رہنا۔

ان میں سے ایک رائٹر ہے وہ اپنی زندگی کی کہانیاں لکھتی رہتی ہے یا پھر گردوپیش کی مسکراہٹوں کو واپس لانے کی کوشش میں مصروف رہتی ہے۔

دوسرا ایک یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہے جو کمپیوٹر پر اپنی یونیورسٹی کے ہزار ہا بچوں کے مستقبل کی سوچ تا رہتا ہے۔ دونوں مقصدیت کا پرچم تھامے خود غرضی سے کوسوں دور روبوٹ کی طرح اپنے اپنے دائرے میں گھومتے رہتے ہیں۔ مددگار حیران ہوتے ہیں کہ یہ عجیب مخلوق ہے جن کو جہاں بٹھا دو بیٹھ جاتے ہیں چھے گھنٹوں کے بعد بھی وہیں بیٹھے ہوتے ہیں روکھی سوکھی کھا کر بھی خوش رہتے ہیں۔ نہ قورمے کی خواہش...... نہ مٹن پلاؤ کی فرمائش۔

ماحول افسردہ ہے۔ ہر وقت خدا سے رحم کی التجا کرتے ہوئے روہانسے بھی ہو جاتے ہیں۔ بچوں کے لیے دل میں سو سو طرح کے وسوسے آتے ہیں، جس کے لیے صدقہ خیرات ہی وہ کارگر نسخہ ہے جو سکون دیتا ہے۔

اردگرد بھی سوگواری کی کیفیت ہے جس سے نکلنے کے لیے ٹیلی فونوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ٹیلی فون ہی مجلسی زندگی کی ضرورت بن کر رہ گیا ہے۔ حکومت بار بار اعلان کر رہی ہے کہ گھروں سے باہر مت نکلو گھروں میں مقیدرہ کر اپنے آپ کو بچاؤ۔

گویا کہ کوئی نظر نہ آنے والا کیڑا پتھر لے کر گھوم رہا ہے جو سر پھوڑ دے گا، گلا دبا دے گا اور جسم کو آگ کی بھٹی بنا دے گا۔ زندگی ہٹو بچو کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی ہے۔

ایسے میں موسم بہار کھڑکی سے جھانک کر اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ پھول کھلے ہوئے ہیں، گلاب نے گرد و پیش کی گندگی کو اپنی نازک پتیوں اور رنگ و روپ اور خوشبو سے ڈھانپ لیا ہے۔

سبزہ بھی مچل مچل کر زمین کے سینے سے نکل کر مسکرا رہا ہے۔ فضا میں خوف اور نئی رُت کی خوشبو گھل مل کر حیرت کا ماحول پیدا کر رہی ہے۔

درختوں کی شاخوں سے نئی نئی کونپلیں نکل رہی ہیں جو میٹھے ذائقے والے پھلوں کی آمد کی نوید سنا رہی ہیں......

دونوں مل کر گنگناتے ہیں۔

دن ہیں بہار کے سولہ سنگھار کے
بالم کے سنگ چلوں آنچل سنوار کے

دونوں اس رت کو نینوں کے کٹوروں میں اور بانھوں کے کلاوے میں بھر لینے کی خواہش میں جینا چاہتے ہیں......

مگر گلی میں نظر پڑتے ہی وہ سوچنے لگتے ہیں امرودوں کی ٹہنیاں کھینچ کھینچ کر کچے امرود توڑنے والے بچے کہاں گئے؟

خودرو پودوں اور پھولوں کی اوٹ سے جھانک جھانک کر دونوں نے امرود توڑنے والے بچوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر خالی سڑکوں پر خوشبو سے بھری اسلام آباد کی تازہ ہوا درختوں اور پتوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر سوال کرتی رہی کہاں گئے وہ دن بہار کے...... وہ راہگزر، وہ مغنی، وہ شاعر، وہ لفظوں کے کاشتکار، وہ ہمیں سراہنے والے...... ہماری خوشبو کی مالا پرونے والے...... بہار کے دن بہار کا سندیسہ تو لائے ہیں مگر یہ سندیسہ دکھ کی چادر میں لپٹا ہوا کیوں ہے؟

بہار سرگوشی کرتی ہے......

قدرت نے کب کہا تھا کہ یہ زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہے گی اور کبھی ختم نہیں ہوگی......

مکان نمبر ۹۰۰

صاف ستھری دھلی دھلائی سڑک سورج کی شعاؤں سے چمک رہی ہے، کل دن بھر بارش اسے دھوتی رہی۔ گلی کے تمام پودے درخت اور پھول نہائے دھوئے لہلہا رہے ہیں۔ جھوم رہے ہیں۔

نازک نازک پھولوں نے بھی شاخوں کے وجود سے نکل کر مسکرانا شروع کر دیا ہے۔ باریک سی شاخوں پر جھولتے یہ پھول اب واپس کبھی بھی ٹہنیوں کی طرف نہیں جائیں گے۔ ٹہنیاں انھیں جھولتا دیکھ کر خوش ہوں گی اور کہیں گی ہم بانجھ نہیں ہیں۔ دیکھو ہماری شاخِ نازک پر پھول کیسی بہار دکھا رہے ہیں۔ جھوم رہے ہیں یہ ہم نے ہی تخلیق کیے ہیں۔

کچھ ہی ہفتوں کی بات ہے یہ پھول اپنی بہار دکھا کر پتیوں کی شکل میں زمین پر بکھر جائیں گے مگر شاخ کی طرف کبھی بھی پلٹ کر نہیں جائیں گے۔

شاید یہی قدرت کی منشا ہے۔

مجھے کھڑکی کے پار وہ منظر صاف دکھائی دیتا ہے جب اٹھارہ سال پہلے ہم اس گلی میں آئے تھے اور یہاں بے نظیر الاٹمنٹ کا پلاٹ سستا ہونے کی وجہ سے خریدا تھا۔ اس وقت یہ زمین متنازعہ تھی نواز شریف کی حکومت تھی اور یہ واقعہ ایٹمی دھماکوں سے ذرا پہلے کا ہے۔ کوئی کہتا تھا ان پلاٹوں کو بینظیر نے اپنے جیالوں میں ناجائز طور پر تقسیم کیا تھا لہٰذا ان کی الاٹمنٹ ختم ہو جائے گی۔

اسی شش و پنج میں ایک دن ہاؤسنگ سوسائٹی کے حاضر سروس ڈائریکٹر علوی صاحب کو ملے اور انھوں نے بتایا: میں نے بھی متنازعہ پلاٹ ہی خریدا ہے۔ یہ الاٹمنٹ کبھی کینسل نہیں ہوگی۔ بس

اسی حوصلے میں ہم نے بھی پلاٹ خرید لیا۔ جب اٹھارہ سال پہلے پلاٹ دیکھنے آئے تو یہاں ایک گاؤں بسا ہوا تھا۔ بھینسیں بکریاں اور مرغیاں گھوم پھر رہی تھیں۔ اس جگہ پر جہاں پلاٹ تھا مقامی لوگوں کا قبضہ تھا۔

پھر ہمارا معمول بن گیا کہ ہم روز واک کرتے ہوئے آتے کچھ دیر یہاں رُکتے اسی گھر کے سامنے ایک مولوی صاحب کا گھر تھا وہ بہت ہی اچھے لوگ تھے ان کی خواتین فوراً بھاگی آتیں اور ہمیں شربت پلاتیں۔

مجھے گھر بنانے کا جنون تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے سی ڈی اے میں ہزار ہا فون کیے ہوں گے اور ہزار ہا دفعہ جا کر شور مچایا کہ ہمیں پلاٹ کا قبضہ دلایا جائے۔

آخر ایک دن معلوم ہوا کہ آج اس علاقے کو تجاوزات سے خالی کرایا جائے گا۔ ہم بھی پہنچ گئے۔ پلاٹوں کو تجاوزات سے خالی کروالیا گیا اور اس کے بعد ڈائریکٹر نے مجمعے سے مخاطب ہو کر کہا آپ میں سے مسز علوی کون ہیں؟ میں ہجوم سے نکل کر سامنے آ گئی انھوں نے کہا...... ہماری اس کاوش کے پیچھے آپ کا ہاتھ ہے۔ میں جب دفتر آتا تھا تو میز پر آپ کی درخواست میرے لیے چیلنج ہوتی اور عملے کے ارکان مجھے پیغام دیتے مسز علوی کا فون آیا تھا، وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں...... یہ فون اور درخواستیں میرے فیصلوں کی ترجیحات بدل دیا کرتی تھیں اور میں سوچتا تھا کہ اس کام کو پہلے کرنا ہے...... یہ سب آپ جیسے لوگوں کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ ہمیں فوکس رکھتے ہیں۔

پلاٹ خالی ہو گئے بہت سوں کا بھلا ہو گیا اور ہم نے گھر بنانے کے لیے اپنی کوششوں کو تیز تر کر دیا۔

ڈاکو قوم

صبح سے اخبار ٹی وی اور میسیجز دیکھ دیکھ کر تھک گئی تھی۔ کورونا کی علامات پڑھ کر یوں لگتا تھا یا تو کورونا ہو چکا ہے یا ہونے ہی والا ہے۔ میں نے بے چارگی سے اپنے گھر کو دیکھا پھر اپنے کمرے پر نظر پڑی۔ کچھ اطمینان ہوا کہ چلیں کمرے میں مصیبت کا وقت گزارا جا سکتا ہے۔

کورونا سے خوفناک طریقے سے مرنے کی ویڈیوز دیکھ دیکھ کر مجھے لگا شاید میرا ابھی آخری وقت آیا ہی چاہتا ہے۔

کورونا سے بچاؤ کی ویڈیوز......کورونا سے بچاؤ کی حفاظتی تدابیر......

میں نے اپنے خدا سے پوچھا!

یا خدا اس دنیا کو چھوڑ کر کہاں چلے جائیں۔

کچھ دیر غم زدہ رہنے کے بعد میں نے ان سب چیزوں پر لعنت بھیجی......اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ زندگی اپنی پوری سچائی کے ساتھ میرے سامنے تھی۔

خوفزدہ سہمی سہمی سی دھوپ۔۔۔ کھڑکی سے باہر کچھ لوگ موٹر سائیکلوں پر ماسک پہنے جا رہے تھے۔

علوی صاحب نے کہا......

ویسے تو پوری قوم ہی ڈاکو تھی مگر اب منافقت ختم ہو گئی ہے اور گلیوں میں سب لوگ ہی ڈاکوؤں کا بھیس بدل کر پھر رہے ہیں...... تمھیں نہیں لگتا جیسے ہم سب ڈاکو ہیں۔

میں ان کی بات کو سنی ان سنی کر کے اٹھارہ سال پہلے والے اس محلے میں پہنچ گئی جب یہاں سڑک بھی نہیں ہوتی تھی۔ پلاٹ الاٹ ہوا تو اس گلی کی آدھی سڑک بنائی گئی تھی اور جب ہم نے

اس پلاٹ پر کھدائی شروع کی تو مقامی لوگوں نے پتھر مارنے شروع کر دیے۔ کھدائی کرنے والی مشین رُک گئی۔ علوی صاحب نے آفس میں بیٹھ کر ہی مجھے فون کیا۔ آج کھدائی نہیں ہو سکتی۔ واقعہ سننے کے بعد میں نے کہا کھدائی آج ہی ہو گی ''اگر آج نہیں تو کبھی نہیں۔''

اُف انہی گلیوں میں کھڑے ہو کر میں نے کس طرح مقامی لوگوں کا مقابلہ کیا تھا اور پھر مدد کے لیے پولیس کو بھی بلا لیا تھا...... پھر پولیس نے ان کو بھگا دیا اور زمین کی کھدائی مکمل ہو گئی...... اس ہنگامے میں ہمارے ساتھ والے ہمسائے ظفر صاحب بھی آ گئے۔ میں نے بڑی ہی مشکل سے علوی صاحب کو بیسمنٹ کے لیے منایا تھا اور وہ مجھ پر ہی احسان عظیم کر کے آدھی بیسمنٹ بنانے کے لیے مشکل سے تیار ہوئے تھے...... ظفر صاحب نے آتے ہی کہا جو غلطی ہم نے کی ہے آپ نہ دہرائیں۔ ہوا کی آنیاں جانیاں نہ روکیں اور پوری بیسمنٹ بنائیں۔ وہی لمحہ وہی گھڑی جب پوری بیسمنٹ کی کھدائی ہو گئی...... اور اب کھڑکی کے اس پار اسی ہال میں مجھ جیسی مجلسی خاتون کی مجلسوں کو زندگی جینے کا موقع ملتا ہے۔

اس جگہ تجاوزات تو ہٹا دی گئیں تھیں۔ گھر کی تعمیر بھی شروع ہو گئی تھی مگر سی ڈی اے میں میرے اتنے چکر لگے کہ آج بھی ہر کمرہ ہر افسر یاد ہے اور اُمید ہے ''وہ بھی مجھے نہیں بھولے ہوں گے۔'' ایک پائی رشوت دیے بغیر جس طرح میں نے کام کروائے وہ ایک الگ کہانی ہے۔ پھر پانی کے حصول کے لیے بورنگ کرنی پڑی جس سے خانہ بدوش آنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے دور دور تک خانہ بدوشوں کی بستی آباد ہو گئی...... اس گلی میں انھیں مزدوری بھی مل جاتی اور پانی بھی......

علوی صاحب نے تو بورنگ کرواتے ہی کہہ دیا تھا گھر کو کربلا مت بنانا۔ پانی کے لیے ہمارا گیٹ چوبیس گھنٹے کھلا رہتا۔

محلے داروں نے شکوہ بھی کیا کہ آپ لوگوں کی وجہ سے یہاں خانہ بدوش بستی آباد ہو گئی ہے لیکن علوی صاحب نے کہا پانی زندگی ہے اور ہم کسی کی زندگی سے نہیں کھیل سکتے...... اور پھر دھیرے دھیرے اس گلی میں اور بھی گھر بننے لگے۔ ہمارے دائیں طرف ایک پلاٹ چھوڑ کر اگلا گھر رشیدہ بھابی یعنی حسن مختار صاحب کا ہمارے ساتھ ہی شروع ہوا...... اس سے آگے ایک

پلاٹ چھوڑ کر مسز ظفر کا گھر بھی بننے لگا، اس کے بعد والا رشید صاحب کا گھر ہم سے کچھ پہلے شروع ہو چکا تھا۔

ہماری لائن کے سامنے صرف ایک گھر خالد صاحب ہی کا تھا۔ باقی سب خالی پلاٹ اور خانہ بدوش ہی تھے جن کی تعداد روز بروز ہی بڑھتی رہتی۔

کتنی شادیاں تھیں جو اس گلی میں تنبو لگا کر ہوئیں۔ کتنا مزہ آتا تھا ہم انھی گلیوں میں اسی سڑک پر بیٹھ کر شادیوں سے لطف اندوز ہوتے۔ پھر دیر تک گھر کے دروازے کھلے چھوڑ کر بیٹھے گپیں لگاتے رہتے۔ گلی کی شادیوں کا بھی کتنا لطف آتا تھا یوں لگتا تھا ہمارے گھر ہی کی شادی ہے، کتنی اپنائیت اور محبت تھی۔ کسی کا تعارف کرواتے ہوئے ''ہمسایہ'' کہہ دینا ہی کافی ہوتا تھا۔ کتنا بھاری بھرکم لفظ تھا...... ''ہمسایہ''

سو رشتوں میں بندھ جاتے، سو محبتوں کے دائرے بن جاتے، سو الفتوں کے در کھل جاتے......

خانہ بدوش

میں تمام دن کا تھکا ہوا، تو تمام شب کا جگا ہوا
ذرا ٹھہر جا اسی موڑ پر تیرے ساتھ شام گزار لوں
(بشیر بدر)

کرفیو کا عالم ہے......سڑک پر یا تو مانگنے والے نظر آتے ہیں یا پھر گاڑیوں میں لوگ انجانی منزلوں کو بھاگتے دوڑتے نظر آتے ہیں۔

دِل بہت گھبرایا تو میں نے علوی صاحب سے کہا چلیں ہوا خوری کے لیے باہر نکلتے ہیں۔ اپنے علاقے سے باہر G-13 کی طرف گئے تو ایک جگہ لوگوں کا ہجوم دیکھ کر میں نے علوی صاحب سے کہا گاڑی روکیں۔

وہاں......ایک بڑا سا بورڈ لگا ہوا تھا جس پر لکھا تھا ''بحریہ دستر خوان''

ایک لمبی لائن تھی غریب لوگوں کی جس میں بچے جوان اور بوڑھے سبھی شامل تھے۔لائن سے ہٹ کر جو لوگ کھڑے تھے ان کے ہاتھ میں چاولوں کی ایک ایک پلیٹ تھی۔نہ ماسک، نہ مخصوص فاصلہ......نہ دُوریاں......نہ حفاظتی تدابیر!

صرف ایک پلیٹ چاولوں کے لیے زندگی داؤ پر لگا دی؟

کیا زندگی کی قیمت ایک پلیٹ چاول ہے؟

ان کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میرا دماغ سوالات کی آماجگاہ بن گیا۔

کیا بھوکا انسان جس کے پاس خواب، خیال، احساس، جذبات، علم و آگہی، ہاتھ پاؤں، آنکھیں اور دماغ سب کچھ ہے وہ اسے ایک پلیٹ چاول پر قربان کر سکتا ہے۔

دل تو چاہا لائن میں لگ کر بھوک کے کرب کو محسوس کر کے دیکھوں......''مگر بسیار خوری میں بھلا بھوک کے کرب کو کیسے محسوس کیا جا سکتا تھا۔''

گھر پہنچی تو میری یادیں مجھے آج پھر اس دور میں لے گئیں جب یہ سب گھر بن رہے تھے۔ گھر کے ساتھ جڑے خانہ بدوشوں سے میری دوستی ہوگئی اور میں روز شام کو چھت پر جا کر ان کے گھروں میں جھانکتی رہتی تھی......

دن بھر کام کرنے کے بعد ان کی مزدور خواتین جو، ان کے ساتھ ہی مزدوری پر جاتی تھیں لکڑی کی آگ جلا کر کھانا پکانے میں مصروف ہو جاتیں۔ ساری فیملی چولہے کے ارد گرد بیٹھ کر کھانا کھاتی اور پھر یہ لوگ دن بھر کے تھکے ہارے سر شام ہی سو جاتے۔

ان کے ہاں ملا جلا ماحول تھا......نہ کوئی پردہ نہ جوان لڑکیوں کی حفاظت کا کوئی سلسلہ، مخلوط طرزِ زندگی گزار رہے تھے۔ گرمیوں میں مچھروں کی بھرمار میں کھلے آسمان تلے چارپائیوں پر سو جاتے۔

یہیں میل ملاپ یہیں ہر سال نئے بچے کی آمد......یہیں الزام تراشیاں......یہیں مجرمانہ کارروائیاں......یہیں محبتیں، یہیں محبتوں میں سلگتے جذبات کی بھڑکتی بجھتی پیاس......ان کے گھروں میں مجھے اکثر ٹھیکیدار اکڑ کر بیٹھا ہوا نظر آتا۔ ہر کوئی اس کی ناز برداریوں میں لگا رہتا۔ خواتین تو مکھیوں کی طرح اس کے آگے پیچھے پھرتی رہتیں۔ ٹھیکیدار ہی انھیں کام دلاتا اور اسی کام کی مزدوری سے ان کا چولہا جلتا۔

میں اکثر فارغ ہو کر پانی بھرنے والی ان خواتین سے باتیں بھی کیا کرتی تھی۔ اس لیے ان سے کافی بے تکلفی بھی ہوگئی تھی۔

انھی خواتین کی مخبری سے میں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ یہی ٹھیکیدار اکثر جوان لڑکیوں کو بنا سنوار کر شام کے وقت گاڑی میں بٹھا کر لے جاتا اور پھر نجانے رات کے کس پہر چھوڑ بھی جاتا۔

عورتیں اپنی ضرورتوں کی سولی چڑھ کر سر شام ہی تیار ہو جاتیں۔ سرخی پاؤڈر لگاتیں اور ٹھیکیدار کی گاڑی میں بیٹھ کر کہیں چلی جاتیں۔ میں کچھ عرصہ تو یہ تماشا دیکھتی رہی اور پھر اکثر ایسا ہوتا میں ایسی عورتوں کا گھر میں آنا اور پانی لینا بند کر دیتی۔

مگر علوی صاحب یہاں بھی مزاحمت کرتے ہوئے مجھے قائل کر لیتے کہ تمھیں ان کے کردار سے کیا لینا دینا......

ان پر نہ تو اسلام اُترا تھا اور نہ ہی کوئی شریعت نہ دین نہ مذہب......

صرف بھوک افلاس اور غربت ہی ان کا دین اور ایمان تھا۔

خانہ بدوش بستی سے ہٹ کر بالکل الگ تھلگ میلے کچیلے کپڑے اور پلاسٹک سے بنی ایک جھونپڑی تھی جس میں ایک تنہا عورت رہتی تھی۔

شاید دن بھر مانگتی پھرتی تھی اور رات کو اپنی اس جھونپڑی میں آ کر سو جاتی تھی۔ سخت آندھیاں بھی آئیں، سردی کا موسم بھی رہا، ژالہ باری بھی ہوئی، شدید گرمی سے بھی دو چار ہونا پڑا مگر یہ عورت وہاں سے ٹس سے مس نہیں ہوتی تھی۔

کہاں سے آئی، کسی رشتے سے وابستہ رہی یا نہیں، کوئی رشتے دار تھا یا نہیں، ہوا سے اُڑتے ان دورو دیوار میں وہ کہاں تک محفوظ تھی؟

میں یہ عقدہ کبھی حل نہ کر پائی...... وہ کسی سے بے تکلف نہیں ہوتی تھی، کسی سے بات نہیں کرتی تھی، ذہنی مریض بھی نہیں تھی۔ وہ کئی سال یہاں رہی مگر اس کا معمول یہی رہا۔ میں نے اپنی مددگار کو کئی دفعہ کہا کہ اسے بلا کر لائے مگر وہ میرے بلاوے پر بھی نہیں آتی تھی۔

انہی گلیوں میں اچانک ایک گونگی عورت بھی آ کر رہنے لگی تھی جس سے متاثر ہو کر میں نے اپنا افسانہ گونگی لکھا۔

سب کے ساتھ تو میں تعلق نہیں رکھ سکتی تھی، البتہ اپنے گھر کے ساتھ جڑے آمنہ اور یوسف کے ساتھ مجھے ہمدردی سی ہوگئی تھی۔ وہ سات مہینے کے بچے کو تین سال کے بچے کی سپردگی میں چارپائی کے ساتھ کپڑے کا جھولا بنا کر اس میں ڈال کر مزدوری کرنے چلی جایا کرتی تھی اور پھر بیچ میں بچے کو دودھ پلانے بھی آتی۔

کبھی تو وہ دونوں بچے ہی روتے رہتے اور کبھی تین سال کا بچہ کھیلتا کھیلتا کہیں دور چلا جاتا اور جھولے والے بچے کے ارد گرد کتے بلیاں اعتماد کے ساتھ یوں پھرتی رہتیں جیسے وہ انھی کا بچہ ہے۔

ایک دن میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ فیڈر پر سینکڑوں مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں اور وہ بچہ

ہاتھ پاؤں مارتا ہوا کبھی منہ میں ڈال لیتا اور کبھی منہ سے فیڈر نکل جاتا۔ مجھ سے یہ حالت دیکھی نہ گئی۔اس کے بعد میں اپنی مددگار کو بھیج کر کچھ نہ کچھ ان بچوں کو کھلا دیتی۔ مجھے ان سے اس لیے بھی ہمدردی تھی کہ انھوں نے ہمارے گھر کی تعمیر میں بھی حصہ ڈالا تھا۔

ایک دن میں نے آمنہ سے کہا۔لوگوں کے گھر بناتے ہوئے تم لوگوں کو اپنا گھر بنانے کی خواہش نہیں ہوتی کہنے لگی باجی! ہم سب کام پر نکل جاتے ہیں، کچھ پس انداز کرتے ہیں تو وہ چوری ہو جاتا ہے۔ بچائیں تو کہاں رکھیں۔ میں نے کہا میرے پاس رکھ لیا کرو۔ اگلے دن ہی وہ کچھ سونے کے زیورات اور پیسے لے کر آ گئی۔ مجھے سب محلے داروں اور خیر خواہوں نے روکا کہ کل کلاں کو اصل زر سے دُگنے کا مطالبہ کر کے محلّہ اکٹھا کر لیا تو کیا کرو گی۔ خوامخواہ بدنامی ہو گی مگر میں وعدہ کر چکی تھی اور سوچ لیا تھا کہ اگر ایسا کوئی مطالبہ ہوا تو جو مانگے گی دے دوں گی......

اس کے بعد وہ میرے پاس پیسے جمع کرتی رہی ہم نے اس کا الگ بیگ بنا دیا تھا اور آخر ایک دن اتنے پیسے ہو گئے کہ اس نے اپنے گاؤں میں ایک چھوٹا سا پلاٹ خرید لیا۔ اس کے بعد جمع کرتی رہی اور پھر ایک دن چار دیواری بھی بنا لی اور یوں ایک دن اس کا گھر بن ہی گیا مجھے اس کا گھر بننے کی بہت خوشی ہوئی۔

ایک دن کیا ہوا سخت سردی کا موسم تھا...... کہ اچانک کسی ایک خیمے میں آگ لگ گئی وہ آگ پھیلتے پھیلتے کئی خیموں تک پہنچ گئی۔ ان کی چیخ و پکار بارش کے شور میں دب گئی اور مجھے رات بھر معلوم ہی نہ ہو سکا۔ صبح اٹھ کر پتہ چلا کہ کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا البتہ کئی گھروں کا سامان جل کر خاک ہو گیا ہے۔ سردی اور بارش میں وہ بیچارے مجبور اور بے بس بیٹھے تھے۔ انھیں اِس حالت میں دیکھ کر سب سے پہلے میں نے اپنے گھر سے سامان نکالا۔ پھر اپنی کچھ سہیلیوں کو فون کیا میری دوست عظمیٰ تو فوراً لنڈا بازار گئی اور گاڑی بھر کر سامان لے آئی، جس میں گدے اور رضائیاں بھی تھیں اور یوں میری سب سہیلیوں نے مِل کر ان کی حسبِ توفیق مدد کی۔

میری مددگار بیمار ہو گئی اور مجھے صفائی کی بہت مشکل ہو گئی۔ انہی دنوں ان خیموں میں ایک بہت بڑا خاندان بھی آ کر رہنے لگا تھا جن کے مرد سائیکلوں پر فرنیچر بیچا کرتے تھے اور خواتین اپنے گھر کے کام کرتی تھیں وہ مزدوری پر نہیں جاتیں تھیں۔ کیونکہ یہ لوگ عورتوں سے مزدوری کروانا بُرا

سمجھتے تھے۔ان کی خواتین برتن اس شاندار طریقے سے دھوتی تھیں کہ سلور کے برتنوں کو شیشہ بنا دیتی تھیں۔ان کا سارا دن کھانا پکانے اور برتن دھونے میں ہی گزرتا۔ میں نے سوچا یہ صاف ستھری خواتین ہیں انھیں صفائی کے لیے بلا لیتی ہوں۔ میں نے ان میں سے ایک جوان لڑکی کو بلایا اور پوچھا صفائی کروگی کہنے لگی جی باجی کیوں نہیں......

وہ اندر آئی تو میں اسے صفائی کا بتا کر خود کسی اور کام میں مصروف ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد دیکھا تو وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بیسمنٹ کے فرش پر بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔

میں نے پوچھا کیا سوچ رہی ہو بشیراں!

وہ خاموش رہی......

میں نے دوبارہ پوچھا۔

تو کہنے لگی باجی میں سوچ رہی ہوں:

اللہ کی شان دیکھو ہمارے پاس رہنے کے لیے ایک انچ جگہ نہیں......اور آپ ”صرف دو لوگ“ اتنے بڑے گھر میں رہتے ہیں۔

میں تو کانپ گئی۔

اور مجھے بہت خوف آیا اس کے بعد وہ پوچھتی رہی باجی کوئی اور کام......

مگر میں نے اسے دوبارہ کبھی کام کے لیے نہیں بلایا۔

گھر بن گیا تو ایک دن یونہی ہم فیض آباد کی طرف واک کرنے نکل گئے اس علاقے میں نئے نئے کام شروع ہو رہے تھے لہٰذا بہت تجسس ہوتا تھا کہ دیکھیں کیا کیا نیا تعمیر ہو رہا ہے۔ واک کرتے ہوئے میں نے دیکھا میرا گھر بنانے والا ایک مزدور شیر خان سڑک کنارے لیٹا ہوا ہے۔ نزدیک کھوکھا تھا، اس سے پوچھا تو کہنے لگا اس کا کوئی گھر نہیں دن بھر مزدوری کرتا ہے رات کو اسی کھوکھے کے پاس لگے تندور سے روٹی کھا کر سو جاتا ہے۔

گھر آئی تو نیند مجھ سے کوسوں دور چلی گئی......اور میں بستر میں منہ چھپا کر آنسو بہاتی رہی۔ علوی صاحب مجھے سمجھاتے رہے کہ دنیا میں لوگ اسی طرح رہتے ہیں۔تم ہر چیز کو اپنے ذہن پر سوار کر لیتی ہو......مگر میں سوچتی رہی، میرے گھر کے در دیوار بنانے والے کے پاس دو گز زمین بھی

نہیں جہاں وہ رات گزار لے......

اگلے ہی دن میں اس کے پاس گئی اور بغیر کوئی تحقیق کیے اسے گھر میں ایک الگ سا کمرہ جس کا دروازہ باہر کھلتا تھا دے دیا......علوی صاحب نے بھی کچھ نہیں کہا۔ان کا خیال تھا غریب بندے کی کیا تحقیق کرنی ؟ کیا کرلے گا بے چارہ؟

سب ملنے والوں نے ڈرایا کہ تمھارے چھوٹے بچے ہیں خدا کا خوف کرو۔

میں ڈرتی رہتی تھی مگر میں نے اس کا بہت خیال رکھا۔اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ میرے بچوں میں بھی غریب پروری کا جذبہ پیدا ہوا۔میرے بچے بھی اس کا بہت خیال رکھتے تھے اور شیر خان نے بھی مجھے کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔

مسز متین، حفیظ، حامد صاحب اور مسز ظفر

آج کئی دنوں کے بعد دھوپ نکلی ہے تو کھڑکی سے باہر کا منظر بہت خوبصورت لگ رہا ہے۔ دھلے ہوئے نکھرے نکھرے درختوں کے پتے...... پارلر سے سجی دوشیزہ کی مانند......

جو گرد و پیش سے اٹھنے والی نظروں کو محسوس کر کے ایک شان بے نیازی سے مسکراتی ہے اور ''وہ جو'' بے اعتنائی سے گزرتا ہوا بغیر دیکھے ایک اچٹتی نگاہ بھی نہ ڈالے...... ستائش بھری نظروں سے دیکھنا اور دیکھا جانا ہی نہ جانے...... اسے دل ہی دل میں کوستی ہوئی نظریں پھیر لیتی ہے۔

یہی شان بے نیازی اور یہی ستائش بھری نظروں کی تمنا لیے قدرت کے حسن کدہ سے سجے درخت اور درختوں پر جھولنے والے برگ و بار درختوں پر آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ میرے بیڈ روم کی کھڑکی کے اُس پار لوکاٹ کے درخت سے چھوٹے چھوٹے لوکاٹ جھانک رہے ہیں اور گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے اُس پار بے بی امرود پتوں سے جھانک جھانک کر جلوے دکھا رہے ہیں۔

اور میں چند سالوں سے آباد...... اور آج کی اس ویران سڑک سے دور...... کھڑکی کے اُس پار اٹھارہ سال پہلے والے اُس محلے کو اپنے خیالات میں آباد کر کے ان مناظر سے لطف اندوز ہو رہی ہوں۔

ہمارا گھر بن کر تیار ہو گیا۔ رشید صاحب کے گھر کی تزئین و آرائش ابھی جاری تھی...... ہمارے ساتھ ہی ظفر صاحب بھی گھر بنا کر شفٹ ہو چکے تھے مگر رشیدہ آپا کا گھر در و دیوار پر چھتوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔

میں اس محلے میں کچھ دروازوں پر دستک دے کر دستِ دوستی بڑھا چکی تھی اور کچھ جان

پہچان بھی پیدا کر چکی تھی۔

پھر کچھ ہی دنوں بعد پتہ چلا کہ اس محلے میں ہر ہفتے ون ڈِش پارٹی ہوتی ہے۔ کچھ ہم خیال خواتین مل بیٹھتی ہیں۔ میں بھی فوراً اپنے حصے کی ڈِش بنا کر اس میں کود پڑی......اور پھر جلد ہی اس گروپ کا حصہ بن گئی۔ کچھ عرصہ یہ سلسلہ زور وشور سے جاری رہا۔ پھر اس گروپ کی روح رواں مسز نذیر گھر بیچ کر لاہور شفٹ ہو گئیں۔ آہستہ آہستہ ملنے ملانے اور ون ڈِش کا یہ سلسلہ پھیکا پڑتے پڑتے ختم ہی ہو گیا۔

ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر ہماری ہی لین میں دو گھر ساتھ ساتھ تھے۔ ایک حامد صاحب کا گھر تھا جو بیوروکریٹ رہے اور دوسرا گھر مسز متین کا تھا۔ دونوں گھروں سے ہی میرے دوستانہ مراسم تھے۔...... بعد میں مسز متین سے زیادہ دوستی ہو گئی۔

وہ کسی کالج کی پرنسپل کی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے ریٹائر ہوئی تھیں۔ لکھنو سے تعلق تھا، کافی نالج ایبل خاتون تھیں، شعر وشاعری کا بھی ذوق رکھتی تھیں۔ اکثر مجھے کچھ نہ کچھ پکا کے پلیٹ سجا کر بھیجا کرتیں اور پلیٹ کے اوپر ایک شعر بھی لکھ کر رکھ دیا کرتی تھیں۔

ان کا حکم ہوتا تھا کہ مجھے شعر کا جواب شعر میں ملنا چاہیے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میری آج بھی عادت قائم ودائم ہے کہ میرے گھر میں آنے والے برتن کبھی خالی واپس نہیں جاتے...... یہ عادت میری ماں کی دین ہے جو آج تک نبھا رہی ہوں۔

اب میرے لیے پلیٹ کا پیٹ بھرنے کے لیے کچھ پکانا اتنا لازمی نہ ہوتا جتنا شعر کا جواب ڈھونڈنا لازمی ہوتا۔ یہ سلسلہ کافی عرصہ چلتا رہا، ان کے گھر پپیتے کے درخت تھے وہ پلیٹ بھر کر مجھے پپیتا بھیجا کرتی تھیں۔ پپیتے کے درخت پر پپیتے کو لٹکتا دیکھ کر میں بھی بہت خوش ہوتی تھی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اس پپیتے میں میرا بھی حصہ ہے۔ مل بیٹھ کر کھانے کی عادت کتنا لطف دیتی تھی، کتنی محبتوں اور برکتوں کے در کھولتی تھی اور ہمسائیوں کی چیزوں پر کتنا حق ہوتا تھا۔

مسز متین تین بہنیں تھیں، ان میں سے صرف ایک یعنی مسز متین ہی کی شادی ہوئی تھی۔ تینوں کے قد ابنارمل حد تک چھوٹے تھے۔ تینوں بہت قابل اور پُراعتماد تھیں۔ مسز متین کی شادی تو ہوئی مگر اللہ نے اولاد کی دولت سے محروم رکھا۔

متین صاحب میرے اس گلی میں آنے سے پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔

مسز متین کی گفتگو بہت دلچسپ ہوا کرتی تھی۔ میں جب بھی ان سے ملنے جاتی وہ لکھنؤ میں اپنی شادی سے گفتگو شروع کرتیں...... ''ہم شادی کے بعد کم خواب کا غرارہ پہنے ہار سنگھار کیے پہلی دفعہ متین صاحب کے ساتھ ڈولی میں بیٹھ کر کسی کے ہاں دعوت پر گئے تو متین صاحب تو بس ہمیں دیکھتے ہی رہ گئے۔اس زمانے میں حجاب تھا، اتنی بے باکی نہ تھی اور میں بیچ میں ہی بات کو کاٹ کر چھیڑ چھاڑ شروع کر دیتی۔

اچھا تو کس رنگ کا غرارہ پہنا تھا آپ نے......اور سچ سچ بتائیں کتنی دفعہ متین صاحب نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔

مسز متین سے بے تکلفی بڑھی تو میں نے مزے لے لے کر ان کی زبانی آپ سے تم اور تم سے تُو ہونے کے قصے بھی سنے......اور حجاب سے بے حجابی میں بھی جھانکا تانکی کی۔

میں اکثر اپنے کاموں سے فرصت پا کر آتے جاتے گاڑی کو ان کے گھر سامنے بریک لگاتی اور ان کے پاس جا بیٹھتی اور پھر لکھنؤ کا قصہ چھیڑ دیتی۔

مسز متین سنا ہے وہاں سبزی اور چھابڑی والے بھی شعروں میں آواز لگاتے تھے......اور بس وہ شروع ہو جاتیں۔لکھنؤ ان کے اندر بستا تھا وہ جب چاہتیں اسے نکال کر باہر لے آتیں اور اس میں کچھ دیر کے لیے جی لیتیں...... انھوں نے اپنے گھر میں ایک گوشہ بنایا ہوا تھا جس میں بیٹھ کر بقول ان کے وہ اللہ سے باتیں کیا کرتی تھیں۔

اور پھر ایک دن وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں ان کا لے پالک بھتیجا اس گھر کا مالک بن گیا۔ پھر ان کی دوسری بہن اس گھر میں رہنے کے لیے آ گئیں اور کچھ ہی عرصے بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ دوسری بہن کے بعد ان کی تیسری بہن حفیظ جو نرسنگ کے شعبے سے ترقی کرتی ہوئیں کرنل کے عہدے پر پہنچ کر ریٹائرڈ ہو گئی تھیں ان کے گھر مستقل طور پر آ گئیں......

مسز متین کے بعد میری حفیظ کے ساتھ بہت دوستی ہو گئی۔ بڑی ورسٹائل خاتون تھیں۔ چار فٹ قد پر ایک خاص وضع قطع کی شخصیت سجی ہوئی تھی۔ اعلیٰ درجے کا حسِ مزاح ان کے تعارف کا ایک حصہ تھا۔ منہ سے مختلف جانوروں کی آوازیں نکالنا، ہر صوبے کا کلاسیکل ڈانس، یوگا، ڈھولکی

کوئی ایسافن نہیں تھا جو انھیں نہ آتا ہو۔ جس محفل میں جاتی اپنی گونا گوں خوبیوں کی وجہ سے چھا جاتیں۔ ہر کسی کے ساتھ بے تکلف نہیں ہوتیں تھیں اور نہ ہی کسی کو اپنے پائے کا سمجھتیں تھیں۔

حفیظ اپنی طرف مائل ہونے والے آرمی آفیسرز کے قصے مجھے بڑی ہی چاہت سے سنایا کرتی تھی۔ ایک دن میں نے اس کا بہت مذاق اڑایا تو سنجیدہ ہوگئی۔

اگلی دفعہ آئی تو اپنے ساتھ جوانی کی تصویریں بھی لے کر آئی اور مجھے دکھا کر کہنے لگی، دیکھو میں جوانی میں کتنی خوبصورت اور با صلاحیت ہوا کرتی تھی۔

مجھے یقین ہوگیا کہ زندگی کے آخری حصے میں چاہت، الفت اور محبت کے یہی قصے آکسیجن مہیا کرتے ہوئے آپ کو زندگی کا جواز مہیا کرتے ہیں۔

پھر یہ ہوا کہ وہ ہر محفل میں میرے ساتھ ہوتی۔ میں نے جب لوک ورثہ میں دو سال میوزک کا پروگرام چلایا تو عام پبلک میں گانے کے ساتھ اس کا رقص لوگوں کے دل موہ لیا کرتا تھا۔ زندگی کا یہی پہلو تھا جو اسے زندہ رکھے ہوئے تھا۔ اپنی تکلیف کبھی کسی سے شیئر نہ کرتیں اور دوسروں کو ہنسنے ہنسانے، خوشیاں بانٹنے اور ان کی مدد کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتیں۔

میں دو مہینے کے لیے آسٹریلیا چلی گئی، واپس آئی تو سب سے پہلے حفیظ کو فون کیا۔ کہنے لگی میں آ جاؤں؟ میں نے کہا حفیظ میں ابھی ٹائم زون سے نہیں نکلی...... کل یا پرسوں آ جانا۔

دوبارہ پھر فون آ گیا میں تھوڑی دیر کے لیے آ جاؤں؟

میں نے کہا آ جاؤ بھئی......

وہ آئی بیٹھی، میں اسے چھٹکلی کہا کرتی تھی اور وہ مجھے تیز گام کہتی تھی......

آئی تو وہ تھوڑی دیر کے لیے تھی مگر کافی دیر بیٹھی رہی اور ہم دیر تک ہنستی رہیں۔

جاتے ہوئے کہنے لگی تیز گام تم جانتی ہو تمہارے جانے کے بعد آج میں پہلی دفعہ ہنسی ہوں۔ پھر اس کی بھتیجے کے ساتھ اَن بن ہوگئی اور وہ مجھے اشاروں کنایوں میں بتا کر بھائی کے پاس لاہور چلی گئی۔

دو ہفتے پہلے جب کورونا کی آمد کے قصے ابھی پاکستان نہیں پہنچے تھے، اس کا فون آیا تیز گام تم سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے میں تمھارے لیے بہت بہت اُداس ہوں۔

میں نے کہا بس میں بیٹھو اور آ جاؤ...... پندرہ مارچ کو حلقۂ احبابِ نثر کو میں گولڑہ ریلوے اسٹیشن پر اکٹھا کر کے تیمور افغانی کو بلا رہی ہوں جو ہمیں ہیر وارث شاہ سنائے گا اور سولہ کو پی این سی اے میں اندو مٹھا کے اعزاز میں بہت اعلیٰ کلاسیکل ڈانس کا پروگرام ہے۔ بس جلدی سے آ جاؤ...... اس نے حسرت سے لمبی آہ بھرتے ہوئے کہا کوشش کرتی ہوں۔

کورونا وائرس چین اور ایران سے ہجرت کرتا ہوا پاکستان آ چکا تھا۔ خوف کی پرچھائیاں پھیلنے لگیں اور ہم گھروں کے اندر سمٹنے لگے۔

چند ہی دن گزرے تھے کہ حفیظ کی ہجرت کا بھی سندیسہ آ گیا۔ وہ جاتے ہوئے بھی مجھے خدا حافظ کہنا نہ بھولی۔ مسز متین کے گھر کے باہر پپیتے کے درخت لہلہا رہے ہیں در و دیوار دونوں بہنوں کی خوشبو سے مہک رہے ہیں۔ میں نے دکھ سے سوچا جب میری آنکھوں میں بھی نور نہ رہا تو یہ سب یادیں آوازیں اور خوشبوئیں بھی ختم ہو جائیں گی......

ان کے ساتھ ہی جڑواں گھر کے مکین حامد صاحب چھوٹے سے قد کے قابل اور خوش اخلاق بیوروکریٹ تھے۔ اکثر گھر کی تزئین و آرائش میں لگے رہتے تھے۔ انکی بیگم بھی بہت خوش اخلاق خاتون تھیں۔ اکثر اپنے ہاتھ سے کھانے پکا کر محلے والوں کی دعوتیں کیا کرتی تھیں۔ میاں کی راج دُلاری بڑی پیاری خاتون۔

حامد صاحب اپنے گھر کی سفیدی کرواتے ہوئے ایک دن گلی میں کھڑے تھے کہ سٹروک ہوا ساتھ ہی فالج کا حملہ بھی ہو گیا۔ جسم بے کار ہونے کے ساتھ قوتِ گویائی بھی ختم ہو گئی اور یوں اچانک ہرے بھرے اس شجر کا زندگی سے تعلق ٹوٹ گیا۔ ملنے جاتے تو بے بسی کے آنسوان کی آنکھوں سے ٹپکنے لگتے۔ وقت نے پلٹا کھایا تو بیگم کی زندگی ہی بدل گئی۔ جیتے جی اس کی آن بان شان سب ختم......اور پھر وہ ایک دن یاسمین بھابھی کو چھوڑ کر انجانی منزلوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس کے ساتھ ہی مسز ظفر کا گھر تھا۔ مسز ظفر کی ادلے بدلے کی شادی تھی۔ دونوں میاں بیوی میں اکثر اَن بن رہتی تھی۔ مسز ظفر بہت ہی حسین سمجھدار ہنسی مذاق کرنے والی انتہائی سلیقہ شعار خاتون تھی۔

عورت کتنی بھی سمجھدار ہو، مرد کی ناقدری اس کی ساری صلاحیتیں ختم کر دیتی ہے۔ مرد کی سمجھ

میں یہ بات کبھی نہیں آتی کہ بیوی کی ناقدری نہ صرف یہ کہ اس کی بربادی کا باعث ہوتی ہے بلکہ بچوں کی نظر میں بھی ماں کا وجود بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اور یوں یہ رویہ پورے گھر کی تہذیب کو تہس نہس کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس کے نقصان کا اس وقت پتہ چلتا ہے جب پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ ان کے گھر کے انھی حالات کی وجہ سے مسز ظفر اکثر میرے گھر آ جاتیں اور پورا پورا دن میرے گھر ہی رہتیں۔ پشاور میں فاسٹ کا کیمپس نیا نیا بنا تھا۔ علوی صاحب ہر ہفتے پڑھانے کے لیے جاتے تو وہ بھی میرے ساتھ ہی پشاور چلی جاتیں۔ ان کی بہن کا گھر کیمپس کے ساتھ ہی تھا وہ وہاں چلی جاتیں اور میں کیمپس کے ہوسٹل میں۔ اکثر ہم کارخانو بازار بھی اکٹھی ہی گھوما کرتی تھیں۔

وہ اکثر مجھے کہا کرتی تھیں سرکاری نوکری کا کتنا فائدہ ہے ہمیں ٹھیک ٹھاک پینشن بھی ملتی ہے اور میڈیکل بھی فری ہے میں اکثر دل ہی دل میں ڈر جاتی اور سوچتی رہتی یا خدا مجھے بیمار نہ کرنا، ہمارے پاس تو نہ کوئی میڈیکل کی سہولت ہے اور نہ ہی پینشن کی آمد۔

ایک دن وہ ہنستے کھیلتے بیمار ہو گئیں۔ ڈاکٹروں کو ان کے کینسر کا علم ہی نہ ہو سکا اور یہ موذی مرض پھیلتا رہا۔

میرے بچے ان دونوں سٹی اسکول میں پڑھتے تھے۔ جو شفاء میں ان کے کمرے کے بالکل سامنے تھا۔ میں بچوں کو لینے جاتی تو ایک گھنٹہ پہلے نکل جاتی۔ گھنٹہ بھر مسز ظفر کے پاس بیٹھتی ان کے ساتھ باتیں کرتی اور پھر بچوں کو لے کر گھر آ جاتی۔ ایک دن میں کسی وجہ سے نہ جا سکی۔ اسی شام ظفر صاحب ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے انھیں ہسپتال سے لے کر میرے گھر آ گئے۔ انھوں نے مجھے اشاروں میں بتایا کہ اب یہ مہمان ہی ہیں......

آپ ملنے نہیں آئی تھیں اس لیے یہ بہت ضد کر رہی تھیں کہ مجھے نعیم کی طرف لے جاؤ۔

پھر میں کچھ دن اور مہمانوں کی وجہ سے ہسپتال نہ جا سکی اور جب گئی تو ان کے کمرے میں بہت سے رشتے دار تھے جو کمرے سے نکل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی مسز ظفر کہنے لگیں اتنے دن سے کیوں نہیں مجھے ملنے آئی؟ میں نے کہا آپ کے اتنے رشتے دار آپ کے پاس موجود تھے آپ

کو پھر بھی میرا انتظار رہتا ہے۔ کہنے لگیں چھوڑو رشتے داروں کو تمہیں دیکھ کر مجھے راحت ملتی ہے۔ میری تکلیف دور ہو جاتی ہے، روز آیا کرو۔

ان کے پاؤں میں ایک پرانی سی چپل ہوتی تھی جس کو دیکھ کر میں ان کا بہت مذاق اُڑایا کرتی تھی اور انھیں بارہا کہتی تھی خدا کے لیے اس چپل کو بدلیں......

اگلے دن گئی تو ان کی حالت بہت خراب تھی، وہ تقریباً نیم بے ہوش تھیں اور مشکل سانس لے رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹروں نے وینٹی لیٹر لگا دیا۔ ان کے بیڈ کے ساتھ وہی چپل پڑی تھی جس کا میں مذاق اُڑایا کرتی تھی۔ میں کچھ دیر بیٹھ کر روتی رہی۔ آج تو وہ میرے آنسو بھی نہ دیکھ پائیں...... مجھے بچوں کو اسکول سے لینا تھا، سو کچھ دیر بعد وہاں سے نکل آئی۔

ابھی بچوں کو کھانا ہی دے رہی تھی کہ ان کی بیٹی روتی ہوئی آ گئیں اور بتایا کہ امی اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔ میں بہت عرصے تک ان کی یاد میں سسکتی رہی۔

محلے میں شروع کے دنوں کا ایک واقعہ یاد آ گیا......

ایک دن میں اور ایوب گلی میں واک کر رہے تھے کہ ظفر صاحب اور حامد صاحب راستے میں مل گئے۔ ان دونوں کے قد تقریباً پانچ فٹ تین انچ ہوں گے، جبکہ علوی صاحب پانچ فٹ پانچ انچ کے ہیں۔ یہ ان کے ساتھ گفتگو میں لگ گئے اور میں گھر آ گئی......

تھوڑی دیر بعد علوی صاحب مسکراتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے اور مجھے کہنے لگا آج تو تم سینہ تان کر اور سر اُٹھا کر چلتی ہوئی گھر آئی ہو گی اور اپنے اوپر بہت فخر محسوس کیا ہو گا۔

میں نے پوچھا کیوں بھئی ایسا کیا ہو گیا۔

ہنستے ہوئے کہنے لگے تم سوچتی ہو گی کیسے سرو قد نوجوان سے میری شادی ہوئی ہے۔

دیکھو! آج مجھے بھی پہلی دفعہ اپنے قد پر فخر محسوس ہوا......

زندگی انھی کھٹی میٹھی یادوں کا خزینہ ہے......

رشیدہ آپا

کل شام بعداز مغرب میں نے علوی صاحب سے کہا چلیں گاڑی میں باہر چل کر دیکھتے ہیں شہر پر کیا بیتی......آئی ایٹ سے نکل کر ہم شکر پڑیاں کی طرف چلے گئے بے رونقی اداسی اور سکوت کا عالم دیکھ کر ناصر کاظمی کا شعر یاد آنے لگا۔

دل تو میرا اداس ہے ناصرؔ
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

نیچرل ہسٹری میوزیم البتہ سرکار کے خرچے پر خوب روشن تھا۔ ریسٹورنٹ بند تھے لوک ورثہ کے گیٹ پر چوکیدار بتیاں جلا کر بیٹھے ہوئے تھے۔

''1969 '' نام کا ریسٹورنٹ اداس تھا لوک ورثہ کے پیچھے ایک کھوکھے کے قریب دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔

چاند تارے کے پاس کچھ ہفتے پہلے گرنے والے جہاز کی جگہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر اندھیرے میں کچھ پتہ نہ چلا......البتہ اندھیرے اور ویرانی میں چائنا سنٹر کے اندر کچھ روشنی نظر آئی۔ چائنا سنٹر کے گیٹ بھی کھلے تھے اور ایک گاڑی بھی کھڑی تھی۔ علوی صاحب نے بتایا کہ یہ قرنطینہ سنٹر ہے۔

اس ویرانی میں چائنا سنٹر کی بتیاں مجھے زہر لگیں۔

اس ویرانے میں کون ان مریضوں کو دیکھتا ہوگا؟

ان پر کیا گزرتی ہوگی......؟

موت کو اپنے سامنے رقص کرتا ہوا دیکھ کر کیا محسوس کرتے ہوں گے۔

زندہ لحد میں اترنا کیسا لگتا ہوگا۔

یہاں سے تو رونے اور سسکنے کی آوازیں بھی باہر نہیں جاسکتیں۔

کھانس کھانس کر بے حال ہونے کے بعد جب ان کی ہمت جواب دے رہی ہوگی تو......

اوک بھر پانی کے لیے لرزتے ہاتھوں کو، اذنِ حرکت ہی نہ ہو تو پیاس کیسے بجھاتے ہوں گے۔

میں نے اپنے گلے پر ہاتھ رکھ کر ٹٹولا......دو کامیاب آپریشن کے بعد میرے گلے میں کتنی گانٹھیں لگی ہوں گی، کتنے زخم ہوئے ہوں گے، کتنی توڑ پھوڑ کے بعد مندمل ہونے والے زخم کیا کورونا کا معانقہ سہہ سکیں گے؟

ہرگز نہیں......

بالکل نہیں......

میں اور زیادہ دُکھی ہوگئی......

اسی کرۂ ارض پر ہڑپہ، موہنجوداڑو اور ٹیکسلا کے نشانات آنکھوں کے گرد گھیرا ڈال کر اُچھل کود کرنے لگے۔

اب روز کا یہی معمول رہ گیا تھا کہ بیڈروم سے ڈرائنگ روم اور ڈرائنگ روم سے بیڈروم......

ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے پاس بیٹھتے ہی اٹھارہ سال پہلے کا منظر مجھے یوں گود لے لیتا ہے جیسے میری بقا کی ذمہ داری اب اسی نے سنبھال لی ہے۔

کھڑکی کے اس پار سامنے والی لائن میں رہنے والے خالد صاحب کا گھر نظر آرہا تھا۔ بہت پیاری فیملی تھی جو اب گھر بیچ کر بحریہ ٹاؤن چلی گئی۔ محرم کی دس تاریخ کو ان کے گھر لنگر چلتا تھا۔ سب گھر والے مل کر حلیم پکایا کرتے تھے۔ مغرب کے بعد سے ان کے گھر دعوت حلیم کا آغاز ہوتا اور رات گئے تک لوگوں کی آمد ورفت جاری رہتی۔

ان کے گھر اسی تزک و احتشام کے ساتھ محفل میلاد بھی ہوا کرتی تھی۔ ان کے دم سے جو رونقیں تھیں کہیں اور جا بسیں۔

اس لائن میں شروع ہونے والے تمام گھر بن چکے تھے۔ صرف ایک گھر رشیدہ آپا کا تھا جو چاردیواری پر چھتوں سے آگے نہ بڑھ سکا تھا۔

اس گھر کے بیسمنٹ میں آتے جاتے نظر پڑتی تو ٹھیکیدار کے ساتھ عجیب سے لوگوں کا ہجوم ہر وقت نظر آتا...... خیمہ بدوشوں کی خواتین کا بھی آنا جانا رہتا۔ تاش کی محفلیں جمتیں، ہنسی مذاق اور ٹھٹھا ہوتا۔ رنگ برنگے لوگوں کا آنا جانا مجھے اور مسز ظفر کو بہت گراں گزرتا۔ کیونکہ ہمیں ایک دوسرے کے گھر جانے کے لیے اس گھر کے آگے سے گزرنا پڑتا۔

شکایت بھی کرتے تو کس سے؟ ٹھیکیدار کو گھر کے مالک کی مکمل تائید حاصل تھی بلکہ اکثر وہ خود بھی اس چوپال کا حصہ ہوتے۔ مالک مکان کی بیگم کو ہم نہیں جانتے تھے۔ ایک دن مالک مکان کی بیگم رشیدہ آپا مکان دیکھنے آئیں تو میں انھیں اپنے گھر لے آئی...... گھر کی تعمیر کے بارے میں پوچھا اور اس گھر میں ہونے والی دھما چوکڑی کے بارے میں آگاہ کیا......

ہر ذہین اور حسین عورت کی ایک ہی کہانی ہے جو وقت کے ساتھ دُہرائی جاتی رہتی ہے۔ ان کی بھی کہانی کچھ ایسی ہی تھی۔

رشیدہ آپا سے مل کر میں بہت متاثر ہوئی۔ میٹرک کے بعد شادی ہوگئی مگر ان کی ذہانت اور آگے بڑھنے کی لپک انھیں اُڑائے لیے پھرتی رہی راستے میں کہیں ٹھہرنے ہی نہ دیا۔

اللہ تعالیٰ نے اُنھیں سات بچوں کی نعمت عطا فرمائی تھی اور ساتھ ساتھ فارسی میں پی ایچ ڈی بھی کی۔

نمل یونیورسٹی میں پڑھاتی بھی تھیں اور ریڈیو پاکستان پر پروگرام بھی کرتی تھیں۔

انتہائی قابل عورت جو پیسے بنانے کی مشین بنی ہوئی تھی...... المیہ تو یہ تھا کہ وہ ناقدری اور بے توقیری کے عذاب میں جل رہی تھی۔

انھوں نے بتایا کہ میں ایک عذاب کو جھیل چکی ہوں۔ میرے میاں نے بنا بنایا گھر بیچ دیا اور اب میں کرائے کے گھر میں رہتی ہوں۔ اس گھر پر بھی ٹھیکیدار نے قبضہ کرلیا ہے اور اس نے میرے شوہر کو بلیک میل کر کے اپنے ساتھ ملایا ہوا ہے۔ وہ اپنا قصہ سنا کر چلی گئیں...... مگر میں اور مسز ظفر دیر تک افسردہ رہیں۔

ان سے تعارف کے بعد ہمیں ان سے الفت سی ہوگئی۔ میں نے اور مسز ظفر نے سوچا کہ ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے۔

ہم نے رشیدہ بھابی کی ہمت بندھائی تو وہ بھی شیر کی طرح بہادر ہو گئیں......

ہمارا اوپر والی منزل کا الگ پورشن تیار تھا اور ہم اسے کرائے پر دینے کے لیے کرائے دار ڈھونڈ رہے تھے۔ ایک دن رشیدہ بھابی نے کہا نعیم اگر تم میرا ساتھ دو تو اس ٹھیکیدار سے نجات حاصل کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ میں اس مکان میں شفٹ ہو جاؤں۔ میں نے رشیدہ بھابی سے کہا آپ فکر نہ کریں میں ڈنکے کی چوٹ پر آپ کا ساتھ دوں گی آپ بس ہمت کریں......

نہ بجلی نہ گیس نہ فرش نہ کھڑکیاں نہ دروازے نہ باتھ روم......مکان کیا تھا اینٹوں کا ڈھیر ہی تھا۔ ٹھیکیدار کی مخالفت ان کے شوہر کی ناراضگی اور تہہ خانے میں چلنے والے کاروبار کی مخالفت مول لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہمسائیگی میں پلنے والی دشمنی اس پر مستزاد...... بہرحال رشیدہ آپا بھی جی دار تھیں انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ یہاں چلنے والے کاروبار سے نجات حاصل کرنے کے لیے مجھے یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑے گا......

ادھر میں نے بھی علوی صاحب سے کہہ دیا کہ ایک مہینے کے لیے پورشن کو کرائے پر نہ دیں میں ایک اہم پروجیکٹ پر کام کر رہی ہوں۔

رشیدہ آپا نے ''آناً فاناً'' فیصلہ کیا اور اس گھر میں شفٹ ہو گئیں۔ ان کے ساتھ ان کی دو بہت حسین بچیاں بھی تھیں جنھیں دیکھو تو دیکھتے ہی رہ جاؤ......

نہ گلی کا ماحول اچھا اور نہ ہی گھر کا......مگر ہم تین عورتوں کا تمام ماحول سے لڑنے کا مضبوط نڈر اور اٹل فیصلہ بہت کامیاب رہا۔ ہم نے ایک دوسرے کی طاقت بن کر سب کو شکست فاش دی۔

کچھ عرصے تک تو میں اور مسز ظفر کچھ نہ کچھ پکا کر بھیج دیتیں پھر میں نے انھیں اوپر والے پورشن کی چابی دے دی۔ ہمارا رعب اور دبدبہ ہی ایسا تھا کہ کسی کی ہمت ہی نہ ہوئی کہ ہم سے آنکھیں ملا کر بات کر سکتا......رشیدہ بھابی نے ٹھیکیدار بدلا گھر بیٹھ کر گھر کی تعمیر شروع ہوئی اور دنوں میں تبدیلی نظر آنے لگی۔

آج ان کے اسی گھر نے ان تمام بچوں کو سمیٹا ہوا ہے۔ لائن سے ان کے گھر گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں اور ہر بچہ اس گھر کی آسانیوں اور آسائشوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

رشیدہ آپا گھر کو سمیٹ کر اپنے بچوں کو لے کر ہنسی خوشی زندگی گزار رہی تھیں۔ سب کی

شادیاں بھی اسی گلی میں ہوئی تھیں۔ لہٰذا ہمیں ایک دوسرے کے خاندان سے قلبی لگاؤ تھا۔ ان کا ایک بہت پیارا بیٹا شبیہہ کرنل کے عہدے تک پہنچ چکا تھا۔

شبیہہ کے ساتھ رشیدہ آپا کی بہت دوستی تھی۔ بلکہ شبیہہ کی سارے محلے والوں سے بہت دوستی تھی اس کے بچے بھی یہیں پیدا ہوئے۔ وہ اکثر گلی میں کھڑا کچھ نہ کچھ کام کروار ہا ہوتا۔ ہر آنے جانے والے سے مخاطب ہوتا، سیاست سے لے کر محلے داری تک ہر قسم کی گفتگو ہوتی۔ ہنس مکھ، لمبا اونچا، انتہائی خوبصورت، خوشگوار خوش اطوار وجیہہ نوجوان......

ایک دن میں کسی کام سے ساتھ والے گھر گئی تو انھوں نے بتایا شبیہہ سی ایم ایچ میں زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے۔ میں تو کانپ اٹھی۔

گھر والوں نے کہا چائے تو پیتی جائیں۔ میں نے کہا چائے اب کہاں حلق سے اُترے گی......

گھر پہنچتے ہی میں نے علوی صاحب سے کہا گاڑی نکالیں اور چلیں سی ایم ایچ چلتے ہیں۔

وہاں پہنچے تو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ رشیدہ آپا غم سے نڈھال، بہن بھائیوں کی بُری حالت اور بیوی تو رورو کر بے حال ہو رہی تھی۔ میں نے وارڈ میں جا کر دیکھا تو اونچا لمبا نوجوان بیڈ پر پڑا زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا۔ اسی رات وہ بے بس نوجوان سارے رشتوں سے منہ موڑ کر دوستوں، رشتے داروں اور محلے داروں کو خون کے آنسو رُلا کر اس دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا اور رشیدہ آپا سسکتی تڑپتی اللہ سے لو لگائے اس کی یادوں کو دل میں سمیٹے ہر ملاقات پر بڑے ہی دُکھ اور کرب سے مجھے کہتی ہیں۔

''نعیم دیکھو میں زندہ ہوں مجھے کچھ بھی نہیں ہوا۔''

اس محلے میں حامد صاحب کے گھر کے اوپر والا پورشن ایک فیملی نے کرائے پر لیا۔ یہ فیملی اپنی خوش مزاجی اور خوش اخلاقی کی وجہ سے جلد ہی محلے کا حصہ بن گئی۔ ان کے بچے بھی سٹی اسکول میں پڑھتے تھے اس لیے ان کے ساتھ سلام دعا تعارف سے کچھ آگے ہی بڑھ گیا۔ انھوں نے بھی اپنی بڑی بیٹی کی شادی اسی محلے میں بڑی ہی شان وشوکت سے کی۔

دبے دبے، گھٹے گھٹے حالات ایک دن دکھاوے کے خول سے نکل کر چیخنے لگے۔ معلوم ہوا اس کے میاں نے اپنی کسی کولیگ سے شادی کر لی ہے اور انھیں بے یار و مددگار چھوڑ کر اس کے ساتھ کہیں اور شفٹ ہو گیا ہے۔

میرے لیے اس کرب کو محسوس کرنا اور اس پر یقین کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا کہ کوئی شادی شدہ انسان اپنے خاندان کو چھوڑ کر کہیں اور بھی منہ مار سکتا ہے۔

میں نہیں جانتی مجھے اپنے اوپر زیادہ اعتماد تھا یا علوی صاحب پر...... کیونکہ اس رشتے کی بنیاد تو اعتماد پر ہی ہوتی ہے اور میرا اعتماد زندگی کے کسی پل شک وشبہ تک بھی نہیں آیا تھا...... اِس لیے اِس واقعے کی صداقت تک پہنچنا میرے لیے حیرت کا باعث تھا۔

کچھ ہی دنوں بعد بچے انگریزی اسکول سے نکل گئے...... کرائے کے لالے پڑ گئے۔ وہ کبھی کپڑے سی کر گزارا کرتی کبھی کچھ اور سوچتی آخر ایک دن اس نے آئی ایٹ کا گھر چھوڑ کر آئی ٹین میں چھوٹا سا گھر لے لیا...... وہاں وہ سموسے رول بنا کر بیچتی رہی اس کے حالات کے پیشِ نظر میں بھی اس سے خریدنے کے لیے بارہا آئی ٹین گئی...... پھر ایک دن وہ سوٹوں کی گھڑی اٹھائے ٹیکسی پر میرے گھر آئی اور بتایا کہ میں اب آئی ٹین کا کرایہ بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی سو میں نے وہ گھر بھی چھوڑ دیا ہے...... میں نے اس سے سوٹ خریدے...... پھر ایک ملاقات میں اس نے بتایا کہ میں احمدیت سے تائب ہو کر مسلمان ہو گئی ہوں۔ سوسائٹی کو یہ حقیقت تسلیم کروانے اور یقین دلانے کے اپنے دکھ...... دربدری کے انہی دکھوں میں ایک دفعہ اس سے میری ملاقات ایک مینا بازار میں ہوئی وہاں وہ ہاتھ سے بنائے بچوں کے سویٹر وغیرہ بیچ رہی تھی۔ میں نے بلا ضرورت وہ بھی خرید لیے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ میرا میاں ساری دولت اس عورت پر لٹا کر اس کی بے وفائی کے زخم کھا کر واپس آ گیا ہے......

تو تم نے اسے معاف کر دیا میں نے حیرت سے پوچھا؟

ہاں میں نے اسے معاف کر دیا ہے۔ اس نے تحمل سے جواب دیا۔

معاف کرنے کا اپنا جبر کوئی کہاں تک کسی کے دکھوں کا مداوا کر سکتا ہے۔

ہمارے ساتھ ہی مسز عمر نے بھی گھر بنایا تھا۔ اپنی دو بچیوں کی شادی کے بعد اپنے اکلوتے بیٹے کو سنبھال کر پَروں کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ میرے بچے ملک سے باہر تھے اور وہ اکثر مجھے دیکھ کر کہا کرتی تھیں کہ لوگ کیسے ظالم ہوتے ہیں اپنے بچوں کو ملک بدر کر دیتے ہیں۔

ملک میں بم دھماکوں کا دھواں پھیلا تو ایک دن اس کے بیٹے نے کہا ماں مجھے خوشی سے باہر جانے کی اجازت دے دو ورنہ میں کنٹینر میں بیٹھ کر چلا جاؤں گا۔

ماں روتی رہی اور بیٹا بہن کے پاس کینیڈا کے لیے محو پرواز ہو گیا......ایک دن دونوں میاں بیوی نے بچوں سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ واپسی پر عمر صاحب کو کسی کام کے سلسلے میں ایک ہفتہ پہلے واپس آنا پڑا۔ ابھی انھیں پاکستان پہنچے چند دن ہی ہوئے تھے۔ کہ اچانک اس دنیا سے منہ موڑ کر عازم جنت ہوئے......

مسز عمر روتی دھوتی جنازے پر تو پہنچ گئیں...... مجھے دیکھتے ہی کہنے لگیں حوصلے بڑھانے والی میری پیاری بہن......

اب بتا میں کیا کروں؟

مسز عمر رورو کر ڈیپریشن میں چلی گئیں۔ پھر کینیڈا بیٹے کے پاس گئیں تو دل نہ لگا......اور اب پاکستان میں رہنے والی بیٹی کے پاس مقیم ہیں۔ ان کا سجا سجایا گھر آج بھی مکینوں کا منتظر ہے۔

میرے سامنے والا گھر سیالکوٹ کے کسی گاؤں کی فیملی نے بنایا اور وہ اس میں شفٹ ہو گئے۔

ڈرائنگ روم کی اسی کھڑکی کے سامنے ان کے بیڈ روم کا دروازہ تھا جو ہمیشہ کھلا رہتا......ہم بھی کچھ ایسے پردے کے پابند نہ تھے۔ وہ بہت سادہ محبت والے دیسی سے لوگ تھے۔

ان دنوں میری بیٹی یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ وہ جینز پر شرٹ کے ساتھ موتیوں والے ہار کے علاوہ تھر اور راجستھانی زیور پہن کر یونیورسٹی جایا کرتی تھی۔ ایک دن وہ خاتون میرے گھر شلوار قمیض کا تحفہ لے کر آئیں......اور مجھے کہا کہ یہ تحفہ میں تمھاری بیٹی کے لیے لائی ہوں کیونکہ ہم نے اسے کبھی شلوار قمیض میں نہیں دیکھا۔ اسے میری بیٹی کے ہر رنگ کے کپڑے یاد تھے، ہر جیولری کا پتہ تھا حتیٰ کہ اسی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے میرے معمولاتِ زندگی کی بھی خبر رکھتیں تھیں۔

آہ میرے ڈرائنگ روم کی یہ کھڑکی قرنطینہ کی ساتھی اور مددگار...... میں نے شیشے پر لگے تمام داغ دھبے دور کیے اور پیار سے اسے اور اس کھڑکی کے پار دیکھنے لگی۔

تمھیں ضرور کوئی چاہتوں سے دیکھے گا
مگر وہ آنکھیں ہماری کہاں سے لائے گا

چودھری صاحب کی بیٹی

اسلام آباد کے بلیوایریا کے اوور ہیڈ برج کے پاس ایک سیکیورٹی گارڈ نے لفٹ مانگی اور میرے میاں نے آج پھر میرے منع کرنے کے باوجود لفٹ دے دی۔

میں نے سمجھانے کی کوشش کی تو کہا۔

انسانوں سے ہمدردی کیا کرو۔

بہت جی لیا۔مزید کیا کروگی جی کر......

میں خاموش ہوگئی اور وہ شخص ماسک پہنے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

علوی صاحب نے پوچھا کہاں جانا ہے......اس نے کہا جانا تو میں نے پنڈی ہے۔

مگر آپ نے کہاں جانا ہے؟

ہم نے کہا ہم نے تو آئی ایٹ جانا ہے۔

کہنے لگا پُل کے اوپر سے......ہم نے کہا ہاں بالکل پُل کے اوپر سے۔

اس نے کہا مجھے پُل کے نیچے اتار دیجیے گا۔

میرے سوالات کے جواب میں اس نے بتایا۔

تیونس ایمبیسی میں سیکورٹی گارڈ ہوں۔جو جناح سپر مارکیٹ سے بھی کہیں آگے ہے۔

اکثر کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ مجھے لفٹ دے دیتا ہے اور پبلک ٹرانسپورٹ کے پاس اُتار دیتا ہے۔آج کل کورونا کی وجہ سے بہت مشکل ہوتی ہے کوئی بھی لفٹ دینے کو تیار نہیں ہوتا۔

میں نے پوچھا صبح کیسے آتے ہو؟

کہنے لگا صبح پچاس روپے کرایہ دے کر آجاتا ہوں۔واپسی پر پچاس روپے بچانے کی کوشش

کرتا ہوں کیونکہ میری کل تنخواہ چودہ ہزار ہے۔ تین بچے ہیں۔ بیوی کپڑے سیتی ہے پھر بھی مہنگائی کے اس دور میں بمشکل گزارا ہوتا ہے۔

ہم نے پوچھا مکان کرائے پر ہے؟

کہنے لگا نہیں......

میری بیوہ پھوپھی کی ایک ہی بیٹی تھی لہٰذا میں اپنی پھوپھوزاد سے شادی کر کے اس کے گھر میں ہی رہتا ہوں۔

آئی ایٹ کا پُل آ گیا ایوب نے اس کی کچھ خدمت کی اور وہ دعائیں دیتا ہوا اُتر گیا۔

گھر پہنچی تو میں کافی آزردہ تھی۔ سوچتی رہی مجبوریوں کا لامتناہی سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ روز نت نئی مجبوریوں کا سن کر اس وبائی کورونا زدہ ماحول میں ڈیپریشن سا ہونے لگتا ہے۔

کمرے کے اندر کھڑکی میں لگے آرگینزا کے پردوں سے دھوپ چھن چھن کر آ رہی تھی۔

کمرہ خوب روشن تھا مگر روشنی آنکھوں میں چبھتی نہیں تھی۔ میں اس مدھم روشنی میں اخبار کی ورق گردانی کرنے لگی۔

اور جب بیل کی آواز پر میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو بیل کرنے والی خاتون کی جھلک نظر آ گئی۔

اُف خدایا......

میں نے ناگواری سے دیکھا اور دوبارہ سے اخبار پڑھنے کی کوشش میں لگ گئی مگر اب اخبار پر میری نظریں نہیں جم رہی تھیں میری توجہ بٹ چکی تھی۔

اس خاتون نے کئی سال پہلے میرے گھر میں کچھ دیر کے لیے کام کیا تھا لہٰذا اسی جان پہچان اور کسی نہ کسی ضرورت کی وجہ سے اس کا میرے گھر میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ بہت باتونی تھی۔ رمضان سے کچھ دن پہلے آئی تو آتے ہی سسکیوں کے ساتھ رونا شروع کر دیا۔ میں نے تسلی دی جوس پلایا اور پوچھا کیا مسئلہ ہے؟

کہنے لگی تین چار لاکھ روپیہ قرضہ چڑھ گیا ہے۔ میں نے کہا ایسی کیا ضرورت پڑ گئی تھی۔

بشیراں نے بتایا میرا میاں شدید بیمار ہے۔ اس سلسلے میں روز چھٹیاں کرنی پڑتی تھیں۔ لہٰذا

کام سے بھی جواب مل گیا ہے۔

بڑی مصیبت یہ نہیں تھی جو اس نے بتائی۔

بلکہ بڑی مصیبت تو کوئی اور تھی۔

بشیراں پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے روتی جا رہی تھی۔

اس نے بتایا چند مہینے پہلے بیٹے کی شادی کی تھی۔

بقول بشیراں کے ہی...... بیٹا الگ سے اپنے دوستوں اور ملنے والوں سے قرض لیتا رہا اور میں الگ سے لیتی رہی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بتایا ہی نہیں......شادی تو دھوم دھام سے ہوگئی مگر اب قرض داروں کا تقاضا ہے کہ قرض واپس کرو۔ وہ روز گھر آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ نوکری بھی چھوٹ گئی میاں بھی بیمار ہوگیا۔

اس نے زاروقطار روتے ہوئے کہا باجی مجھ سے کام کروا لو اور مجھے کچھ رقم بطور قرضہ دے دو۔

میں اس کی کہانی سن کر حیران ہوگئی اور پوچھا قرض لے کر اتنی دھوم دھام سے شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کہنے لگی ہمارے ہاں ویسے لڑکی نہیں دیتے لمبی چوڑی شرائط ہوتی ہیں۔ بس ان رسم و رواج میں پھنس گئی۔

میں نے اس کے آنسوؤں سے متاثر ہو کر اچھی خاصی معقول رقم اسے یہ کہہ کر دی کہ یہ پیسے تمہارے میاں کے علاج کے لیے ہیں۔ تمھارے بیوقوفانہ فیصلوں کی میں ہرگز ذمہ دار نہیں ہوں۔

بعد میں اس کی ایک محلے دار نے مجھے بتایا کہ بشیراں نے اتنی دھوم دھام سے بیٹے کی شادی کی کہ پورا محلّہ حیران تھا کہ شاید اس کی کوئی لاٹری نکل آئی ہے۔ پانچ تولے سونا، لہنگے غرارے، بیوٹی پارلر اور ہوٹل ہر، ارمان پورا کیا۔

اور آج چند دنوں بعد ہی پھر سے اس کا رونا دھونا سننے کی مجھ میں ہرگز ہمت نہ تھی سو میں نے بیل کی آواز پر دانستہ منہ پھیر لیا۔

زندگی غلط فیصلے یا پھر بروقت فیصلے نہ کرنے سے کیسے کیسے مسائل کا شکار ہوتی ہے۔

میری نظر اپنے پرانے محلے کی طرف لوٹ گئی۔

اسلام آباد شفٹ ہوئے......تو ایوب کے رشتے کے ماموں ملنے کے لیے آئے......

انھوں نے بتایا کہ آپ کے گھر سے چھ سات گھر کے فاصلے پر ایک چودھری صاحب کا گھر ہے وہ میرے ساتھ ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ یہاں سرکاری افسر ہونے کی وجہ سے پلاٹ ملا تو سروس کے دوران ہی گھر بنا لیا۔ بیگم فوت ہوگئی ہیں دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ آپ لوگ ان سے ضرور ملتے رہا کیجیے گا۔

بہت سے دن گزر گئے میں تو نہ جا سکی ایک دن چودھری صاحب کی دونوں بیٹیاں میرے گھر آئیں۔ ایک زیر تعلیم تھی اور دوسری ٹیچنگ کے شعبے سے وابستہ تھی۔

بڑی اچھی سلجھی ہوئی بچیاں تھیں۔ وہ مجھے بھی اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر چلی گئیں۔

میں ایک ہی دفعہ ان کے گھر گئی تو احساس ہوا کہ میرا دوبارہ اس گھر میں آنا مشکل ہے۔

انتہائی گھٹن زدہ ماحول۔ والد بہت ہی سخت طبیعت کے شکی مزاج انسان تھے۔ بچوں پر ظلم کی حد تک سختی کرتے تھے بلکہ جوان اولاد پر ہاتھ بھی اٹھانے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ ان کے گھر میں کسی انسان کا دو منٹ بیٹھنا بھی مشکل تھا۔ اپنی سخت اور کرخت طبیعت کی وجہ سے وہ انسانوں سے ہی نہیں انسانیت سے بھی دور ہو گئے تھے۔ نہ کسی رشتے دار سے کوئی تعلق رکھا اور نہ ہی کسی محلے دار سے۔ وہ کسی ہمسائے سے بھی نہیں ملتے تھے۔

ان کے والد اپنی بچیوں کو صرف ہمارے گھر ہی آنے کی اجازت دیتے تھے۔ بچیاں کبھی کبھار میرے گھر آجاتیں اور دبے دبے لفظوں میں اپنی وینٹی لیشن کر جاتیں۔

ان دنوں میں بھی بہت مشکل حالات سے گزر رہی تھی۔ کیونکہ میری ساس ذہنی اور جسمانی طور پر معذور تھیں۔ چھوٹے بچوں کے ساتھ ان کو سنبھالنے کی ذمہ داری میں شب و روز کا کوئی ہوش ہی نہ تھا۔

ویسے بھی ایسے گھٹن زدہ ماحول اور ڈیپریشن زدہ لوگوں کے ساتھ تعلق رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔

بہت سا وقت گزر گیا ہم اپنا گھر بنا کر دوسری گلی میں شفٹ ہو گئے۔ ان سے ملنے ملانے کا قصہ بھی پرانا ہو گیا۔

ایک دن میں اور ایوب باتوں میں مگن کسی کام سے جی ایٹ کی طرف جا رہے تھے کہ اچانک

میں نے ایوب کو گاڑی روکنے کے لیے کہا......

انھوں نے سائیڈ پر گاڑی روک دی۔

اور پوچھا کیا ہوا؟

میں نے کہا گاڑی ریورس کریں۔

انھوں نے گاڑی ریورس کی اور جہاں میں نے کہا روک دی۔

میں نے گاڑی کا شیشہ ہٹا کر گرین بیلٹ پر بیٹھی ہوئی خاتون کو قریب سے دیکھا تو میرا اشک یقین کی منزل طے کر کے آنکھیں جھپکنے لگا۔

گرین بیلٹ پر لمبے "جو کبھی حسین تھے" بال کھولے پھٹے ہوئے میلے کپڑوں میں ملبوس ایک جوان لڑکی بیٹھی تھی......

یہ لڑکی وہی تھی جس کے بارے میں مجھے ابھی گزرتے ہوئے کسی جانی پہچانی شبیہ کا واہمہ سا ہوا تھا۔

لڑکی کے سامنے ایک ٹوٹا پھوٹا میلا پرس بھی پڑا ہوا تھا۔

وہ کبھی اپنے میل سے بھرے بالوں میں خارش کرنے لگ جاتی کبھی قہقہے لگانے لگتی اور کبھی منہ بسور کر رونے لگتی۔

اسے دیکھ کر میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔

ایوب نے مجھے سسکیاں لے کر روتے ہوئے دیکھا تو پوچھا:

ایک پاگل لڑکی کو دیکھ کر اتنا کیوں رو رہی ہو؟

دنیا میں بے شمار لوگ اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھتے ہیں۔

میں بھرائی ہوئی آواز اور آنسوؤں کی برسات میں صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

"پرانے محلے میں چودھری صاحب کی سب سے چھوٹی بیٹی۔"

بخاری صاحب

کورونائی ماحول میں کھڑکی سے ادھر بہت کچھ بدل گیا دوستو!

تقریباً دو مہینوں کے بعد اپنی شخصیت کو تھوڑا قابلِ قبول حالت میں بدلنے کی خواہش میں اچھا سا سوٹ نکالا تو اس کی سلائیاں ادھیڑ کر جسم کے لیے موزوں اور متناسب بنانے کے لیے دوبارہ سے سلائی لگانی پڑی۔

لپ اسٹک کی نمی نرمی اور ملائمت ختم ہو چکی تھی۔

وہ گھڑیاں جو میرے بچوں نے تحفتاً عطا کی تھیں اور جس کی وہ خبر بھی رکھتے تھے کہ آپ نے میرے والی گھڑی کیوں نہیں پہنی۔

آج بہت دنوں بعد دیکھیں تو روٹھی روٹھی سی نظر آئیں۔

وہ جیولری جسے میں نے سامنے والی دراز میں رکھا ہوا تھا تاکہ بروقت میچنگ پہننے میں دقت نہ ہو، اداس اداس سی دکھائی دی۔

جوتوں کی الماری کھولی تو کئی ملکوں کی ورائٹی اور پھر اپنے مقامی کھسوں اور کولہاپوری چپلوں کی بہتات دیکھ کر کچھ دیر تو رُک کر دیکھتی ہی رہ گئی۔

یہ ورائٹی یوں جمع ہوئی کہ بہو بیٹی اور بیٹوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر بڑی محبت سے لے کر دیے تھے۔ یہ سب میری قدم بوسی کے لیے ترستے ہوئے اپنی رائیگانی پر افسردہ نظر آئے۔

ایک پرانا پھٹیچر جوتا جو آجکل میرا منظورِ نظر تھا، دروازے کے پاس ہی پڑا رہتا ہے۔

یہ دربان جوتا کبھی کبھار ہوا خوری کے لیے جاؤں تو گھر سے باہر سڑکوں پر موجود کورونا کو مسلتا، گھسیٹتا اور موت کی نیند سلاتا میرے پاؤں کو محفوظ رکھ کر، کورونا کو ہٹو بچو کہتا میری توجہ کا منتظر رہتا ہے۔

آج بلا وجہ ہی چلتے چلتے اپنا ہینڈ بیگ بھی اُٹھا لیا...... میرے ہینڈ بیگ میں پیسے ہوں نہ ہوں کاپی پین ضرور ہوتا ہے...... اسے کھول کر دیکھا تو اس میں مطلوبہ چیزیں نہ تھیں دو مہینے سے اسے دیکھا ہی نہیں تھا......

ساڑھیوں والی الماری کھولی تو انھوں نے کہا:

''اے نکہت بادِ بہاری جا راہ لگ اپنی''

بعد از دو پہر میری دوست سلمیٰ صدیقی کا فون آیا۔ پتریاٹہ کی پہاڑیوں سے تو نیچے اتر آئی ہوں۔ تمہارے گھر کے پاس ہوں۔

تم بھی احتیاط کرتی ہو...... میں بھی......

مگر چند قدموں کے فاصلے نے مشکل میں ڈال رکھا ہے۔

ملنے آؤں یا نہ آؤں؟

میں نے کہا آؤ بھئی آؤ۔

جی آیاں نوں!

ہم سوشل ڈسٹنس کے ساتھ بہت دیر بیٹھیں۔ حالاتِ حاضرہ پر اپنے اپنے خیالات کا تبادلہ کرتی رہیں......

اس کی شکل پر بھی وہ تر و تازگی نہ تھی......

اچانک میری نظر نے ایک اور منظر دیکھا......

کھڑکی سے باہر کالے میلے کپڑوں والا شخص ڈگڈگی بجاتا ہوا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ اس کا بندر بھی ہے جو خوف کی اس فضا سے بے نیاز جس میں آج کل عقل و شعور والی مخلوق مبتلا ہے، مالک سے اٹھکیلیاں کرتا اُچھلتا کودتا پھدکتا سامنے سے گزر گیا۔

اور میں سوچتی ہی رہ گئی کہ آس اُمید بھی کیسے کیسے سراب دکھاتی ہے۔

کیا کوئی گھر سے نکل کر اس دور میں اپنے بچوں کو بندر کا تماشا دکھاتا ہوگا؟

کس آس میں کیا سوچ کر وہ گھر سے نکلا ہوگا۔

چند ہی لمحوں میں اس کا جواب یوں ملا۔

سر پر جھاڑو، وائپر اُٹھائے ایک بزرگ نے میرے گھر کی بیل دی۔

میرے میاں نے دروازہ کھولا اور بلاضرورت اس سے منہ مانگی قیمت سے بھی زائد دے کر کئی وائپر اور جھاڑو خرید لیے اور وہ ہماری طرح کے بزرگ...... جو اللہ کی نہیں...... دنیا کے ناخداؤں کے بنائے ہوئے معاشی قوانین کی وجہ سے میرے گھر سے باہر کی بیل پر ہاتھ رکھ کر مدد کے لیے التجا کر رہا تھا، میری سوچ کو جھنجھوڑتا ہوا...... اور ہمیں دُعائیں دیتا ہوا خوشی خوشی چلا گیا۔

مجھے یاد آیا ایک دفعہ ایسے کسی پُر آشوب حالات میں میرے والد نے ایک سائیکل والے پر ترس کھا کر سائیکل پر لدی تمام چیزیں منہ مانگے پیسے دے کر خرید لی تھیں اور پھر کافی عرصے تک میری والدہ میرے والد کو ڈانٹ ڈپٹ کرتیں ان چیزوں کا مصرف ڈھونڈتی رہتی تھیں۔

فیس بک پر ایک بہت پیاری بچی نے سمندر پار سے میری تحریریں پڑھ کر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر لکھا تھا...... آنٹی آپ کی خاموش فیس بک دوست بوبی ہوں اور آپ کی تحریروں کی مداح بھی...... آپ کی تحریریں پڑھ کر اپنا وطن، اپنا محلّہ اسلام آباد اور اپنا گھر بہت یاد آتا ہے۔

ایک سمندر پار بچی عظمیٰ نے لکھا:

صبح آنکھ کھولتی ہوں تو فیس بک پر ''کھڑکی کے پار والی'' تحریر ہی ڈھونڈتی ہوں۔ باجی پلیز پلیز ضرور لکھا کریں آپ کو معلوم نہیں ہم کتنی چاہت سے پڑھتے ہیں۔

عالمی افسانہ فورم کے وحید قمر کی پسندیدگی کا اپنا انداز...... وہ اکثر میری تحریریں عالمی افسانہ فورم پر لگا کر مجھے حیران کر دیتے ہیں اور میں دنیا کے مختلف لوگوں کے تبصرے پڑھ کر سوچتی ہی رہتی ہوں کہ وحید قمر صاحب کا شکریہ ادا کروں یا پھر ان سب توجہ سے پڑھنے والوں کا...... یہ سب محبت بھرے اور خوشبو سے بھرے سندیسے مجھے تازہ دم کر کے سفرِ زیست سے لُطف اُٹھانے کے لیے پھر سے راہِ شوق میں دھکیل دیتے ہیں۔

میرے مسیحاؤ......

آپ سب میری آنکھوں کی پتلیوں میں رہتے ہو...... میری روشنی ہو۔

اسی طرح کے بے شمار تبصرے مجھے تازگی کا اک نیا احساس دلاتے ہیں اور میرے تخیل میں رنگ بھر دیتے ہیں۔

آج صرف بوبی کی یادیں ہی لکھنے کو دل چاہ رہا ہے۔

بیس سال پہلے لاہور سے اسلام آباد شفٹ ہوئے تو اس گھر سے چند گلیوں کی دوری پر جو گھر رہنے کے لیے کرائے پر لیا وہ نیا نکور تھا۔آئی ایٹ سیکٹر نیا نیا آباد ہو رہا تھا۔ ہماری گلی کی سڑک پر بھی بجری پڑی ہوئی تھی اور اُمید تھی کہ شاید چند ہفتوں میں بن جائے گی...... کچھ گھر آباد تھے کچھ زیرِ تعمیر اور کچھ مکمل ہو کر کرائے داروں کے منتظر۔

میرے ساتھ کونے والا گھر تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔بس نوک پلک سنواری جا رہی تھی۔ایک دبلا پتلا لمبا سا شخص جو بہت ہی مہذب اور وضع دار سا دکھتا تھا، روز ہی آتا اور گھر کی نوک پلک سنوارنے میں بہت دلچسپی لیتا۔آخر ایک دن میں نے بچوں سے کہا اس انکل سے پوچھ کر آؤ کب شفٹ ہو رہے ہیں۔

بچوں کے پوچھنے پر انھوں نے مسکرا کر جواب دیا:

عنقریب......

میں بہت خوش ہوئی اور پھر روز ہی ان کی شفٹنگ کا انتظار کرنے لگی۔

چند ہفتوں کے بعد ہی بخاری صاحب اپنی پانچ جوان بیٹیوں دو بیٹوں اور ایک بزرگ ساس کے ساتھ اس مکان کو گھر بنانے کے لیے شفٹ ہو گئے۔میں تو خوشی سے نہال ہو گئی۔

گھر آباد ہونے کی خوشی...... ہمسائیوں کے بس جانے کی خوشی...... اتنی زیادہ تھی کہ مجھ سے انتظار نہیں ہو رہا تھا کہ کب یہ سامان وغیرہ سیٹ کریں اور کب میں ان کے گھر جاؤں۔

بچوں کو بھیج کر پوچھتی رہی کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتایئے......

کتنا حوصلہ ملتا تھا اور کتنا طاقتور ہوتا تھا صرف یہ ایک جملہ ''کوئی خدمت کا موقع دیجیے''، یعنی کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتایئے۔اس وقت ہماری پوری گلی میں اس جملے کا بہت چلن تھا۔

گھر گئی تو پتہ چلا ان بچوں کی والدہ کی عمر پینتیس سال تھی۔چولہے پر ہنڈیا چڑھائی ہوئی تھی۔بچے اسکول اور میاں آفس گئے ہوئے تھے اور وہ اُون سلائیوں سے سویٹر بنا رہی تھیں...... اچانک ہارٹ اٹیک ہوا ہاتھ میں اُون سلائیاں تھیں، کچھ خانے ایک سلائی پر اور کچھ دوسری پر اور وہ کُرسی کے ساتھ ایک طرف گر گئیں......اور فوراً ہی مالک کے بلاوے پر سعادت مندی سے لبیک کہتے ہوئے ملکِ عدم سدھار گئیں۔

جاتے جاتے بخاری صاحب کو انتہائی سگھڑ، سلیقہ شعار، محبت پیار اور تہذیب والے بچوں کی ذمہ داری سونپ گئیں۔ بچوں کی معصومیت بے وقت یتیمی اور حیران کن حسین چہروں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ یہ لوگ میانوالی کے تھے اور ان کے ہاں ایک خاص تہذیب تھی۔ بڑوں کا ادب احترام اور بچوں کا گھر سے باہر نہ نکلنا اور گھر کے کام کاج میں دلچسپی لینا...... چونکہ نانی حیات تھیں لہٰذا وہ ان بچیوں کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ نانی اپنی جواں سال بیٹی کی ذمہ داریاں اپنے داماد کے ساتھ مل کر بہت عمدگی سے نبھا رہی تھیں۔ یہ بچیاں ہر وقت اپنے آپ کو مصروف رکھتیں۔ سوئی سلائی سے لے کر ہر کام میں دلچسپی لیتیں۔ مجھے یہ گھر بہت اپنا اپنا سا لگا۔ بچیوں نے بہت ہی محبت سے کہا آنٹی آپ ہمارے گھر ضرور آیا کریں۔ ہمیں تو ابو کی طرف سے کسی کے گھر جانے کی اجازت نہیں ہے۔

مزاج کی ہم آہنگی اور نانی اماں کی وجہ سے میری ان لوگوں سے بہت دوستی ہو گئی۔

میرے بھی بچے چھوٹے تھے۔ جب فرصت ملتی میں ان کے گھر چلی جاتی بچیاں فوراً اپنی اپنی بنائی چیزیں مجھے دکھانے کے لیے خوشی خوشی لا کر رکھ دیتیں اور میری تحسین پا کر خوشی سے پھولے نہ سماتیں......

ایک دفعہ میں شیفون کا سوٹ پہن کر ان کے گھر گئی تو ان کی ایک بیٹی طاہرہ نے مجھے کہا آنٹی یہ سوٹ دو دن کے لیے مجھے دے دیں۔

میں نے کوئی سوال پوچھے بغیر اسے بھیج دیا۔

دو دن بعد مجھے سوٹ ملا تو اس پر دھاگے سے چھوٹے چھوٹے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ شیفون کا سادہ رسٹ کلر کا سوٹ بالکل بدل کر رہ گیا۔ وہ سوٹ اتنا خوبصورت دکھائی دے رہا تھا کہ میں طاہرہ کے سگھڑاپے پر حیران رہ گئی۔

زندگی کے اس پہر میں اس راز کی گہرائی کو جان پائی ہوں...... کہ اگر آپ کا طرزِ عمل سود و زیاں سے مبرا ہو کر بدلے کی اُمید رکھے بغیر معمولی سی نیکی کا کام بھی کر لے تو زندگی کے کسی نہ کسی دور میں وہ نیکی پلٹ کر آپ کی قدم بوسی کے لیے ضرور آتی ہے۔

ایک بہت دلچسپ واقعہ بھی یاد آ رہا ہے۔ ان دنوں میری امی اللہ بخشے حیات تھیں۔ میرے پاس رہنے کے لیے آئیں تو ان کی ساتھ والی نانی اماں سے دوستی ہو گئی۔ کبھی امی ان کے گھر چلی

جاتیں اور کبھی وہ ہماری طرف امی سے ملنے آ جاتیں۔

ایک دفعہ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھیں گپ شپ میں مصروف تھیں۔ میں نے چائے بنائی اور بیٹی سے کہا: انھیں ڈرائنگ روم میں چائے دے آؤ۔

وہ چائے میز پر رکھ کر کانپتی ہوئی میرے پاس آئی۔ وہ اتنا ڈر گئی تھی کہ اس سے بات بھی نہیں ہو رہی تھی۔ تحقیق کی تو معلوم ہوا دونوں خواتین باتیں کرتے کرتے اپنی اپنی نقلی بتیسیاں نکال کر ایک دوسرے کو دکھا رہی تھیں۔ اسی دوران میری بیٹی چائے لے کر کمرے میں چلی گئی اور وہ بُری طرح ڈر گئی......

ان تمام بچیوں کی شادی بھی اسی گھر میں ہوئی۔ چار بچے باہر چلے گئے باقی بھی اس شہر سے کہیں اور منتقل ہو گئے۔ نانی کا انتقال ہو گیا اور آخر میں بخاری صاحب اکیلے رہ گئے...... پھر وہ بیمار ہو گئے اور پتہ چلا انھیں کینسر ہو گیا ہے۔ بیٹا انگلینڈ لے گیا اور وہاں وہ اس دنیا سے کنارہ کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی محبوب بیوی کے پاس چلے گئے۔

آج بھی انھیں یاد کرتے ہوئے شائستگی اور تہذیب میں گندھی بخاری صاحب کی شخصیت آنکھوں کے سامنے آ کر مسکرانے لگتی ہے۔ بخاری صاحب کے انگلینڈ جانے کے بعد اس گھر کو تالا لگ گیا اور آج کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے ان کی سب سے چھوٹی بیٹی کے محبت بھرے جملوں نے جو کینیڈا مقیم ہے، بخاری صاحب کے گھر کا تالا کھول کر مجھے ان رونقوں کی یاد دلا دی جس کا کبھی میں بھی حصہ تھی۔

کورونا وائرس

گاڑیوں کی ایک لمبی لائن بغیر ڈرائیوروں کے گلی میں پارک ہے۔ پتہ نہیں یہ کب تک سڑکوں کے فاصلے ماپیں گی اور ان کو چلانے والے کب خوف سے نکل پائیں گے۔

وہ دیکھیں ایک پٹھان عورت ایک بڑی سی گٹھڑی اُٹھائے بغیر ماسک پہنے اپنے گھر کی طرف جا رہی ہے یقیناً اس کا گھر بھی ہمارے پاس ہی کہیں مضافات میں ہوگا۔

شاید کوڑے کے کسی ڈھیر پر......

شاید کسی اُجڑے بے آباد سے گھر میں......

اسی گٹھڑی سے تو اس کا چولہا جلے گا، اسی سے تو اس کے پیٹ کا دوزخ بجھے گا۔

درخت لہلہا رہے ہیں پھول کھلے ہوئے ہیں، سوکھی ٹہنیوں پر بھی رنگ روپ آ رہا ہے ننھی منی سی پتیاں شاخوں کے اندر سے تخلیق ہو رہی ہیں مگر یہ کیسا جرثومہ ہے جو صرف انسان ہی کا دشمن بنا ہوا ہے۔

اذان کی آواز بھی گونج رہی ہے مگر گلی میں بھاگ بھاگ کر جانے والے نمازی کہیں نظر نہیں آ رہے۔

عجب سوگوار سا ماحول ہے اُداسی ہڈیوں میں سرایت کر رہی ہے۔

جن کے گھر میں یہ جرثومہ داخل ہو چکا ہے ان پر کیا بیت رہی ہوگی۔

اے زندگی! جن کے گھر کھانے کو کچھ نہیں وہ کیسے ہوں گے؟

وہ مائیں جن کے بچے سمندر پار آباد ہیں وہ کیسے خون کے آنسو پیتی ہوں گی۔ نیندیں ان پر حرام ہوں گی۔

گلی میں صرف آئیس کریم والا اپنی مخصوص آواز میں بچوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ اگر یہ سب نہیں کرے گا تو اپنے بچوں کو کھانا کیسے کھلائے گا۔

ابھی میری دوست کا لاہور سے فون آیا۔ میری اس دوست کے پانچ بچے ڈاکٹر ہیں اور وہ لاہور کے مختلف ہسپتالوں میں اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ اس نے بتایا کہ ٹی وی پر اعداد و شمار غلط بتائے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹروں کو ابھی تک کوئی حفاظتی اور مدافعاتی سامان نہیں دیا گیا۔ پتہ نہیں درآمد شدہ کٹیں کہاں جا رہی ہیں۔ نزلے زکام اور بخار سے مرنے والوں کے بارے میں حکومت کا مؤقف ہے کہ چونکہ ان کا کورونا ٹیسٹ نہیں ہوا تھا اس لیے اسے کورونا کے کھاتے میں نہیں ڈالیں گے۔

ہسپتالوں پر پہرہ ہے۔ دل حیران، آنکھیں اُداس اور لب خاموش۔

آج ایک پروگرام کی بہت سی قسطیں ایک ساتھ دیکھیں تو آزردہ اور غمزدہ دِل پھوٹ پھوٹ کے رویا......

فیصل وڑائچ کی میزبانی

''پروگرام'' 1971 میں ہوا کیا تھا۔

صدیق سالک صاحب کی کتاب سے ماخوذ:

''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے ہوئے دیکھا''

حمود الرحمان کمیشن کی رپورٹ سے استفادہ۔

''ڈاکومینٹری کا نام'' دیکھو سنو سمجھو۔

یحییٰ خان بھٹو شیخ مجیب الرحمان اور جرنل امیر عبداللہ نیازی۔

پاکستان کے ساتھ کس کس نے کیسے کیسے کھیلا...... اور مشرقی پاکستان کو ہمارے لیڈروں جرنیلوں اور سیاستدانوں نے کس کس طرح ذاتی مفادات کی خاطر نوچ پھینکا......

بھٹو نے نوجوان طبقے کے جذبات کو بھڑکایا......

یحییٰ کے غلط فیصلوں نے ڈبویا......

نیازی کی بددیانتی نے سرنگوں کیا......

اور دو قومی نظریہ جس کی بنیاد پر پاکستان بنا اس کو ہم نے خود دریا برد کر دیا۔
لمحۂ فکریہ تو یہ ہے کہ یہ سب ریشہ دوانیاں اور تخریب کاری کی کوششیں آج بھی ختم نہیں ہوئیں بلکہ جاری وساری ہیں۔
آج کھڑکی کے اُس پار کیاری میں پیلے پھول کچھ پژمردہ اور بوجھل بوجھل سے نظر آ رہے ہیں۔ دِل گزرے ہوئے واقعات کے بوجھ تلے دبا جینے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔

زیدی صاحب

گھر میں داخل ہوتے ہی ایوب نے کہا:

''دیکھو چاند سا مکھڑا آ گیا۔''

ہیں...... کہاں گئے تھے؟

میں نے ان کی حجامت دیکھ کر ان کی لا ابالی اور بے پرواہ سی من موجی طبیعت سے گھبرا کر پوچھا۔

اگر سچ سچ بتا دیا تو تمھیں غصہ آئے گا۔

میں نے یقین دلایا کہ میں کچھ نہیں کہوں گی اور نہ غصہ کروں گی۔ بتایئے کہاں سے حجامت کروائی......؟

جواب ملا:

فٹ پاتھ پر بیٹھا حجام بہت پریشان تھا میں نے سوچا اسے کیوں نہ خدمت کا موقع دوں۔ جو اس سے حجامت کرواتے ہیں آخر وہ بھی تو انسان ہی ہیں۔

کتنے پیسے دیئے؟

اس نے ستر روپے مانگے میں نے ہزار دے دیئے۔

ضرورت مند تھا بے چارہ...... کب سے اس کا کام رُکا ہوا تھا۔

انسانیت کا حوالہ کوئی معمولی حوالہ تو نہیں تھا۔

اب میں کیا کر سکتی تھی خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

دلیل سے تو کوئی وکیل بھی ان سے نہیں جیت سکتا تھا میری کیا بساط......

کورونا، لاک ڈاؤن اور قرنطینہ یہ تین نام سن سن کر گزشتہ دو مہینوں سے خوف کا جو ماحول بنایا یا پھر بن گیا تھا اب اس کے اثرات ''نمایاں ہو کر سامنے آ رہے تھے۔ سلمیٰ اعوان کا فون آیا۔ عجیب مایوسی کا عالم ہے یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری......اور بھی کچھ دوستوں نے رابطہ کیا کسی نے ڈرایا کسی نے دھمکایا کسی نے یہودیوں کی سازش کہا کسی نے کورونا کو چائنا کے سپر پاور بننے کے خواب کی شرارت بتایا۔ کسی نے کفنانے دفنانے کے خوفناک عمل کی کہانیاں سنا کر پریشانی میں اضافہ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

یقین کیجیے......

سب کے پاس اپنے اپنے موقف کے مضبوط دلائل بھی تھے۔

میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا کسی کا چہیتا امریکی امداد کے حصول کے لیے باہر کھڑا تھا۔

میں نے اسے پہچانتے ہی کسی کی دی ہوئی امانت اس کے چہیتے کے سپرد کی اور دماغ کے تانے بانے میں جلتے بجھتے چراغوں کی لو تھام کر بیٹھ گئی۔

ابھی چند دن ہی ہوئے تھے ہمیں اسلام آباد کے نئے گھر میں شفٹ ہوئے۔ ابھی سامان بھی پوری طرح نہیں کھولا تھا۔ میری ساس جو ذہنی اور جسمانی طور پر بے شمار عوارض سے لڑ رہی تھیں، انھیں نئے ماحول اور نئے گھر کا عادی کروانا اچھا خاصا مشکل کام تھا۔

دروازے پر بیل ہوئی تو میں نے لپک کر دروازہ کھولا۔ ایک اونچی لمبی جوان سی خاتون بڑی ہی بے تکلفی سے گھر میں داخل ہوئی۔ بے ساختگی اور دیرینہ جان پہچان کی سی بے تکلفی سے آتے ہی کہنے لگی۔ ہم اس محلے میں سب سے پہلے آئے تھے۔ لہٰذا جب کسی گھر میں سامان اترتا ہے تو بڑے شوق سے دیکھتے ہیں اور سامان ہی سے اندازہ لگا لیتے ہیں گھر کے مکین کیسے ہوں گے۔

آپ کا سامان آیا تو میرے بیٹے نے کہا امی آپ کے مطلب کے لوگ آ گئے ہیں۔ سامان سے تو کافی باذوق لگتے ہیں۔

سو میرا دل چاہ رہا تھا آپ سے فوراً ملوں......

میں نے آتے ہی محلے میں اتنی گرمجوشی سے استقبالیہ جملے سنے تو خوش ہو گئی۔ لاہور سے آئی

تھی اور لاہوریوں کے تو خون میں مجلسی ماحول کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہوتا ہے۔

میں نے باتیں کرتے کرتے اپنی ساس کے کمرے کو یہ سوچ کر باہر سے کنڈی لگا دی کہ کچھ دیر بعد سلیقے سے ان کے بارے میں سمجھا دوں گی۔

میری ہمسائی نے پوچھا آپ لوگ گھر میں کتنے افراد ہیں۔ میں نے کہا ہم میاں بیوی، تین بچے اور ساس جو ڈیمینشیا کی مریض ہیں۔

میری بات سنتے ہی وہ چوکنی ہوگئی۔

جس صوفے پر وہ بیٹھی تھی اس کے پیچھے میری ساس کا کمرہ تھا۔ میری ساس بھی گھر میں نئی آواز سن کر دروازے تک آئیں دروازے کو بند پا کر انھوں نے وائپر اُٹھایا، اپنی مخصوص آواز اور لہجے کے ساتھ میری شان میں قصیدہ پڑھتے ہوئے دروازے پر مارنا شروع کر دیا۔

میری ہمسائی جو بڑی ہی چاہت سے مجھے ملنے آئی تھی اچانک خوفزدہ ہو کر اُٹھی اور اُٹھ کر باہر کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔

یہ چند لمحوں ہی کا قصہ تھا۔ نہ تو میں ساس کے کمرے کا دروازہ کھول سکی اور نہ ہی ہمسائی کو واپس بلا سکی۔ چائے کے گرم کپ سے چائے کی خوشبو بھاپ بن کر بکھر گئی اور میں نے باہر کا دروازہ بند کر کے اپنی ساس کے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ نئے محلے میں اس نئے واقعے نے کئی اور ہمسائیوں کو بھی باخبر کر دیا تھا۔

میں اسے شہرت کہوں یا اپنی رسوائی کہوں
مجھ سے پہلے اس گلی میں میرے افسانے گئے

یوں تو ہمیں معلوم تھا کہ نئے شہر اور نئے محلے میں آپا کے ساتھ رہنا اور اہلِ محلّہ کو اس بات کا عادی بنانا بہت مشکل کام تھا۔ کیونکہ پرانے محلے میں تو سب جانتے تھے۔ میری ساس جنھیں ہم آپا کہتے تھے، ڈیمینشیا کے ساتھ ساتھ شوگر کی بھی مریض تھیں۔

لاہور میں آپا کے بے شمار واقعات میں سے ایک واقعے کا ذکر تبرکاً کرتی چلوں تا کہ کہانی کو سمجھنا آسان ہو۔

ہم لاہور کی جس بستی میں رہتے تھے وہاں اچھا خاصا مانوس سا ماحول تھا۔ سب لوگ ایک

دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ میری ساس جنھیں ہم آپا کہتے تھے، اکثر گھر سے نکل جاتیں اور کسی نہ کسی کے گھر چلی جایا کرتیں تھیں، یہ روز کا ہی معمول تھا۔ کیونکہ انھیں گھر میں بند کرتے تو ان کا جارحانہ انداز زیادہ مشکلات پیدا کرتا۔

ایک دفعہ گھومتی گھومتی کسی ایسے گھر میں چلی گئیں جو ہمیں نہیں جانتے تھے۔ آپا اس گھر کے اندر تھکی ہاری ہانپتی کانپتی داخل ہوئیں اور اپنی بہو کے دردناک اور خوفناک قصے سنا کر ایسی ہمدردیاں سمیٹیں کہ انھوں نے بہت خاطر تواضع کی اور آپا کو گھر تک چھوڑ کر گئے۔

پھر تو آپا کا معمول بن گیا جونہی موقع ملتا گھر سے نکل جاتیں اور اس مخصوص گھر کو ڈھونڈ کر وہاں چلی جاتیں۔

ذہنی خلفشار کی ایک قسم یہ بھی تھی کہ ان کا دماغ عجیب وغریب قصے تخلیق کر لیتا تھا۔ ایسے قصے جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہوتا اکثر کیا ہمیشہ ان قصوں کی ہیروئن میں ہی ہوا کرتی تھی۔

کافی عرصے کے بعد ایک محفل میں میری ایک خاتون سے ملاقات ہوئی۔ وہ میرے پاس آئیں اور مجھے کہا آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں! کبھی میرے گھر آیئے نا!

میں نے کہا میں اپنی گھریلو مصروفیات کی وجہ سے گھر سے باہر نہیں نکل سکتی آپ ہی آ جایئے گا۔

اس نے میرا ایڈریس پوچھا۔ ایڈریس سمجھ کر چونک گئی اور کہا:

وہاں تو ایک بوڑھی خاتون رہتی ہے جس کی بہو اس کے ساتھ بہت ظالمانہ سلوک کرتی ہے، آپ اس کو جانتی ہیں۔ میں نے کہا بہت اچھی طرح سے......

اس نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا لوگوں کو ظلم کرتے ہوئے خدا یاد نہیں رہتا۔

آپ کبھی ملی ہیں اس بہو سے؟

میں نے کہا روز ملتی ہوں......

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

میں نے اس کی حیرت کو کم کرتے ہوئے کہا وہ ''ظالم بہو میں ہی ہوں۔''

وہ اور بھی حیران ہوئیں اور کہنے لگیں آپ تو ہرگز ایسی نہیں لگتیں۔

میں نے کہا:

میرے پاس کوئی دلیل نہیں جس سے میں آپ کو قائل کرسکوں۔

آپ کا دل مانتا ہے تو یقین کرلیں نہیں مانتا تو نہ کریں۔

اور آج بھی میرے پاس کوئی دلیل نہیں تھی کہ میں اپنی ہمسائی کو قائل کر کے کچھ دیر کے لیے اپنے پاس بٹھا کر سمجھا سکتی۔ میری ہمسائی تو میرے گھر دوبارہ کبھی نہ آئی۔ البتہ میں کبھی کبھی جب لاہور یاد آتا تو اس کی طرف چلی جاتی۔

باتیں کرتے کرتے جب کبھی وہ لاہور سے متعلق کچھ سوال کر دیتی تو میں زار و قطار رونے لگتی اور کہتی...... کیا کروں اسلام آباد میں میرا دل نہیں لگتا۔

وہ مجھے تسلی دیتے ہوئے کہتی:

فکر نہ کرو اس شہر میں آنے والا ہر نیا شخص اسی طرح زار و قطار روتا ہے اور پھر کچھ عرصے بعد جب اس شہر کا عادی ہو جاتا ہے تو یہاں سے کہیں اور جانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

تم بھی عادی ہو جاؤ گی۔

بہر حال وقت اچھا ہو یا بُرا گزر ہی جاتا ہے۔ میری ساس کو فالج کا اٹیک ہوا اور وہ بستر سے لگ گئیں اور میرا باہر کی دنیا سے واجبی سا تعلق بھی ٹوٹ کر رہ گیا۔

اپنی یہ ہمسائی مجھے بہت اچھی لگیں تھیں لہٰذا کبھی کبھار ان کے ہاں میں ہی چلی جاتی اور جب جان پہچان تھوڑا اور آگے بڑھی تو وہ بھی کبھی کبھار ڈرتے ڈرتے آجاتی۔

یہ میری ہمسائی جس کا نام شہلا حسن زیدی تھا اور ان کے میاں حسن زیدی جو ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، بہت کمال کے لوگ تھے۔

دونوں کی مجلسی طبیعتیں تھیں، حلقہ احباب بھی خاصا وسیع تھا۔ شہلا کو کھانا پکانے میں ایک خاص ملکہ حاصل تھا اور زیدی صاحب کو دعوتیں کرنے کا بہت شوق تھا۔ دونوں کی عادتیں ایک دوسرے کی معاون تھیں۔ لہٰذا ان کے گھر لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ چالیس پچاس لوگوں کی دعوت تو معمولی بات تھی۔ کبھی رشتے داروں کی محفلیں کبھی دفتری دوستوں کی دعوتیں کبھی شعر و سخن کی محفلیں کبھی میوزک کی محفلیں کبھی محفل نعت اور کبھی اہلِ محلّہ کی دعوتیں۔

اور جب یہ سلسلہ بھگتا لیا جاتا تو بچوں کی سالگرہ کی دعوتیں شروع ہو جاتیں پھر بچوں کے پاس ہونے کی دعوتیں شروع ہو جاتیں۔ ان کے گھر دعوت ہوتی تو قورمے اور پلاؤ کی خوشبو بند کواڑوں سے نکل کر محلے والوں کے گھروں میں گھس کر ان کی حسِ لطافت کو گدگداتی تو ان کا دل مچل مچل کر پکار اُٹھتا:

''بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی''

مزے کی بات تو یہ تھی کہ شہلا کے پاس کوئی کل وقتی نوکر نہیں تھا۔ وہ ساری دعوتیں خود اکیلی ہی بھگتاتی۔

چٹنیاں تو ایسی ایسی چٹخارے دار بناتی کہ لذتِ طعام و دہن کے چودہ طبق روشن ہو جاتے۔ میں اکثر اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتی ''شہلا تمھارے ہاتھ تو جو بھی لگ جائے تم اس کی چٹنی بنا دیتی ہو۔''

ایک دن دوپہر کو میں اس کے گھر گئی وہ تحمل سے میرے ساتھ باتیں کرتی رہی۔ چہرے پر اطمینان، پُرسکون لہجہ اور گھر میں بھی کوئی ہلچل نہیں تھی۔

اچانک باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ آج شام کو میرے گھر پچاس لوگوں کی دعوت ہے۔ میں تو گھبرا کے اُٹھ گئی اور معذرت کرتے ہوئے کہنے لگی آپ بتا دیتیں تو میں آج آپ کے گھر نہ آتی۔

کہنے لگی ارے کچھ نہیں بیٹھو، پچاس لوگوں کا کھانا تو میری دو گھنٹے کی مار ہے۔

میں نے تو زندگی میں کبھی ایسی جی دار خاتون دیکھی ہی نہ تھی اور نہ ہی روز روز اتنی بڑی بڑی دعوتوں کا معمول۔ لہٰذا اس منفرد خاتون سے دوستی تو ہونی ہی تھی۔

شہلا کی اپنی خصوصیات تھیں اور حسن بھائی کی اپنی منفرد پہچان!

حسن بھائی جیسا خدا ترس انسان بھی کوئی دوسرا نہیں تھا۔

پاپڑ والا، ریڑھی والا، غبارے والا، گاڑیاں صاف کرنے والا اور نہ جانے کس کس کا رزق ان کے گھر سے وابستہ تھا۔ ان کے گھر میں ہر وقت غریب لوگوں کا تانتا بندھا رہتا۔ اپنے والدین سے بے انتہا محبت کرتے تھے راولپنڈی میں جس قبرستان میں ان کے والدین دفن تھے، اس

قبرستان کے ملازمین کے تو وارے نیارے تھے۔

قبروں پر مٹی ڈالنے والے، قبر پر پانی کا چھڑکاؤ کرنے والے، قبروں پر پھول اُگانے والے سب ان کی عنایات کے ہر وقت مستحق رہتے۔ بے شمار غریب رشتے داروں کے گھر کے چراغ ان کے دم سے جلتے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم نے خیرات کا سلیقہ اور غریب نوازی کا طریقہ انہی سے سیکھا۔

اسلام آباد آئے تقریباً سال ہی ہوا تھا کہ میری ساس اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ ہم اس نئے شہر سے آشنا نہ تھے۔ یہاں مجھے ایوب کے ایک بچپن کے دوست جاوید صاحب یاد آ رہے ہیں۔ وہ فوراً آئے اور انھوں نے کفن دفن گاڑی وغیرہ کے سارے انتظامات کروا دیئے۔ ایسے موقعے پر کی گئی مدد دُہرائی نہ بھی جائے تو عمر بھر یاد رہتی ہے۔ اور یقیناً اللہ کے پاس بھی یہ نیکی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتی ہوگی۔

میری ساس کے آخری انتہائی بیمار دور میں سات بچوں میں سے کوئی ان کے پاس نہ تھا۔ دو بیٹے ملک سے باہر تھے مگر وہ فوتگی پر بھی نہیں آئے۔ بیٹیاں بھی مرنے کے بعد ہی جنازے پر آئیں۔

ایوب کو اس بات کا بہت قلق تھا مگر اس نئے شہر میں لوگوں نے اس طرح مدد کی کہ ہم حیران رہ گئے۔ پارک میں جنازہ پڑھنے کے بعد اچانک حسن زیدی صاحب نے بلند آواز میں سب سے مخاطب ہو کر کہا ابھی جنازہ نہ اُٹھاؤ......

پھر انھوں نے انتہائی دلنشین انداز میں قرآن پاک کی تلاوت کی اور رقت آمیز دُعائے مغفرت کروائی۔

ایوب نے مجھے گھر آتے ہی بتایا زیدی صاحب کی تلاوت نے تو رونگٹے کھڑے کر دیئے۔

زیدی صاحب شاعر بھی ہیں اور جب کسی محفل میں ترنم سے شعر پڑھتے ہیں تو محفل لوٹ لیتے ہیں۔

ایوب بہت غیر سوشل اور تنہائی پسند انسان ہیں۔ جذبات کے اظہار میں انتہائی بخل، دوستیاں بھی وہی جو اوائل عمری میں ہوگئیں۔

اس کے بعد تو چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

آپا کے اس دنیا سے جانے کے بعد بھری محفل میں ایوب نے کہا...... ''میری والدہ مرحومہ کے سات بچے تھے مگر سات بچوں کی ماں کو اس کی اولاد میں سے کسی ایک نے بھی نہیں سنبھالا، صرف نعیم نے ہی ان کی خدمت کی۔ ہم سات بہن بھائی نعیم کے پاؤں دھودھو کر بھی پیئیں تو بدلہ نہیں اُتار سکتے۔''

میرے لیے ایوب کا یہ اعتراف حیران کن تھا۔ آج بھی سوچتی ہوں تو حاصلِ زندگی یہی ایک جملہ ہے جو سو جملوں پر بھاری ہے۔

بہرحال بات ہو رہی تھی زیدی صاحب کی۔ اس فیملی سے ہماری ایسی پکی دوستی ہوگئی جو آج تک اپنی پوری آب و تاب سے قائم و دائم ہے۔

آپا کی وجہ سے ہماری گزشتہ بارہ سال سے کوئی سوشل لائف نہیں تھی۔ پارٹیاں دعوتیں نئے لوگوں سے ملنا ملانا ایسا کچھ بھی نہیں تھا ہماری زندگی میں......

کافر عشق ہوئے حمد و ثناء بھول گئے
نام بت یاد رہا یادِ خدا بھول گئے

آپا کی رحلت کے بعد آہستہ آہستہ ہم ان دونوں میاں بیوی کا ہاتھ پکڑ کر زندگی کی طرف لوٹنے لگے۔

مجھے ادبی زندگی کے راستے پر دھکا دینے، سراہنے اور میری حوصلہ افزائی کرنے والی یہی شہلا حسن زیدی تھی جس نے میری بکھری صلاحیتوں کو (اگر کچھ تھیں بھی تو انھیں) یکجا کر کے میری حوصلہ افزائی کی۔

شہلا کے سب بہن بھائی اور والدہ امریکہ میں تھے۔ لہٰذا انھوں نے شہلا کو بھی سپانسر کیا ہوا تھا۔ امیگریشن کے ناز نخرے اُٹھانے کے لیے انھیں امریکہ کے تواتر کے ساتھ چکر لگانے پڑتے تھے۔ بچے تو اس نئی دنیا میں جا کر اس ماحول میں رچ بس گئے مگر شہلا نئے ماحول میں نہ ڈھل سکی اور...... بکھر گئی۔

اب یہ گھر بھی مکینوں کے انتظار میں ویرانی سمیٹے اپنے در و دیوار کے ساتھ کھڑا تو ہے مگر ہر

اینٹ کے بندھن میں سرایت کرتی اُداسی اسے گھیرے رکھتی ہے۔

گیٹ پر بکھرے مرجھائے ہوئے پتوں پر انسان کے پاؤں کے نشانات نہیں بن پاتے، اسی لیے تو وہ ہوا کے دوش پر اُڑتے پھرتے ہوئے کبھی گیٹ سے لپٹتے ہیں اور کبھی صحن میں اٹھکیلیاں کرتے ہوئے لُڈیاں ڈالتے رہتے ہیں۔

دروازہ

آپ نے کبھی دیکھا یا محسوس کیا...... ہواؤں کو گنگناتے شعاؤں کو رقص کرتے...... مٹی کی بنی دیواروں میں چنی اینٹوں کو خوشی سے چمکتے ہوئے۔ آپ نے محسوس کیا گوشت پوست کے انسان میں خوشی کی لہریں دوڑتی ہیں تو اس کا احساس کِھل اُٹھتا ہے اس کے محسوسات میں خوشبو سی پھیل جاتی ہے۔ اس کا اعتماد جی اٹھتا ہے اس کی آنکھوں کی لو کئی گنا بڑھ جاتی ہے، اس کی آواز میں سریلا پن اور شگفتگی آ جاتی ہے اور زندگی خون بن کر رگوں میں دوڑنے لگتی ہے۔

ہاں ایک دن اسی آنگن میں اسی گیٹ کو اسی دروازے کو کھول کر میرا بھائی اور بھابھی میرے والد کو جو بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ پچھلی سیٹ پر لٹا کر لاہور سے لائے تھے...... اور میرے والد نے بھی ہمت نہیں ہاری تھی...... وہ جانتے تھے کہ میری بیٹی بچوں کے جانے کے بعد اکیلی ہے وہ تنہائی کے عذاب میں جل بجھ کر عید کیسے گزارے گی......

ابو کے آنے کی خبر کیا پہنچی...... میں نے جلدی سے اُن کی من پسند چیزیں اکٹھی کرنی شروع کر دیں۔ راولپنڈی کے بہت پرانے بازار اور بہت پرانی سڑک سید پور روڈ پر جا کر تمباکو کی دُکانیں ڈھونڈیں۔ وہاں سے تمباکو...... کمہار کی دُکان سے چلم اور ایک دُکان سے بہترین حقہ اور کوئلے خریدے اور پھر حقے کی نلی میں پانی کا پائپ لگا کر ہلکا سا چلا کر چھوڑ دیا...... حقہ ٹھنڈا ہوتا رہا...... حقے کو ٹھنڈا کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ اِسی ٹھنڈک نے ہی تو چلم میں جلتے بجھتے کوئلوں کی تپش کو دھیمے دھیمے سلگ سلگ کر راکھ بنانا تھا۔ ابو کے آنے کا وقت ہوا...... تو میں نے کوئلوں کو سلگایا۔ چلم کے سوراخ میں چکنی مٹی کا ڈھیلا رکھا، اُس پر تمباکو رکھا۔ تمباکو پر تھوڑا گڑ ڈالا اور اُس تمباکو کے گڑ ملے ڈھیر پر سلگتے کوئلے رکھ کر چلم کو ٹھنڈے حقے پر سجا کر لاؤنج میں رکھ دیا اور اب تمباکو کی

خوشبو یا بد بو پورے لاؤنج میں پھیل کر ابو کی آمد کی خوشی میں خاموشی سے در و دیوار کی طرف دیکھ رہی تھی۔

جونہی ابو گھر میں داخل ہوئے اُن کے چہرے پر مانوس مسکراہٹ پھیل گئی جو یقیناً مجھ سے زیادہ حقے اور تمباکو کی مشترکہ محبت کا نتیجہ تھی۔ وہ کچھ دیر صوفے پر بیٹھے اور اشارہ کیا۔ حقہ میری طرف کھسکا دو۔ حقہ اور ابو کی پوزیشن مطلوبہ مقام پر ترتیب دے دی گئی......تو انھوں نے ایک لمبا کش لگایا۔ مسکرائے اور لمبی ہوں کھینچی...... اِس ہوں کا مطلب تھا......انھیں تمباکو پسند آیا۔

میں بھی اِس خدمت پر پھولی نہ سما رہی تھی اور پھر اسی شام عید سے پہلے عید ہوگئی۔ میری تنہائی پردوں کی دبیز تہوں میں دب کر کہیں روپوش ہوگئی اور میں کتنی دیر اپنے والد کے پاؤں پکڑ کر بیٹھی سہلاتی رہی۔ میں پوچھتی رہی ابو تھکے تو نہیں...... وہ مسکرا کے کہتے ......نہیں بھئی نہیں......اور میں جانتی تھی جو بیمار بیٹھ بھی نہ سکتا ہو وہ بھلا پانچ گھنٹے کا سفر کر کے تھکا بھی نہ ہوگا۔

خوشیاں تو یہ ہوتی تھیں۔ بے لوث اور بے غرض جو احساسات کی دنیا میں سرور بھر دیتی ہیں۔ رشتوں کی مہک مشینی زندگی نگل گئی۔ خوشیوں کا حصول ظاہری ٹپ ٹاپ سے ہوتا ہُوا ہوا کی لہروں میں اُڑنے لگا۔ کبھی ادھر کبھی ادھر......

احساس کی حس کہیں دبیز پردوں میں چھپ گئی۔ لاک ڈاؤن شاید اسی دھول کو صاف کر رہا ہے۔

گلی میں ہنستے کھیلتے پانچ بچے اچھل کود کرتے، ہاتھ میں پکڑا تھیلا ادھر اُدھر پھینکتے گیٹ پر پہنچے تو ان میں سے ایک نے بیل کی۔ صحت مند بچے گورے گورے گال اور گورے گورے میلے ہاتھ۔

تہہ در تہہ جمی میل ان گورے ہاتھوں اور نرم پتلی پتلی انگلیوں کے حسن کو چھپانے میں ناکام ہو چکی تھی۔ میں کھڑکی سے ان کی شرارتوں بھری اچھل کود دیکھ رہی تھی۔ چار دیواری کو مقید کرنے والے گھر کے دروازے کو دیکھا۔

شاید اسی دروازے ہی کو گھر کہتے ہیں جس نے گلی اور اس گھر میں حدِ فاصل قائم کر رکھی تھی۔ اور اس گھر کو گھر بنا رکھا تھا۔ لکڑی کا دروازہ جس کی لکڑی کبھی کسی درخت کے ساتھ پیوست ہو کر ہری بھری ہوگی اس کے تن سے بھی پتے اور کونپلیں پھوٹی ہوں گی، اس پر بھی پھول کھلتے ہوں گے۔ اور پھر ایک دن تیز دھار آلے سے کاٹ کر اسے درخت سے علیحدہ کر دیا گیا ہوگا اور لکڑی

کو بے جان کر کے کسی کارخانے میں بھیج دیا ہوگا...... اور پھر کارخانے کے مالک نے اس سے حسب منشا کوئی نہ کوئی شاہکار تراش لیا ہوگا۔

اور آج یہ دروازے کی صورت اینٹوں کی بنی اس چاردیواری کو گھر بنانے کے لیے دروازے کی صورت کھڑا ہے۔

میں نے اسی لکڑی سے بنے دروازے کو کھولا اور بچوں سے مخاطب ہو کر پوچھا کیا چاہیے۔

کہنے لگے سوکھی روٹی!

میں نے کہا سوکھی روٹی تو نہیں ہے۔

لاک ڈاؤن نے سنبھل سنبھل کر کھانے کا سلیقہ سکھا دیا ہے۔ اتنا ہی پکاتے ہیں جتنا کھانا ہو۔

کہنے لگے تو پھر دس دس روپے ہی دے دو۔

میں نے کہا آٹا لو گے......

کہنے لگے دے دیجیے۔

پہلے یہ بتاؤ آپ لوگ بھائی ہو؟

کہنے لگے دو بھائی ہیں ہم اور تین الگ ہیں۔

میں نے کل ہی بازار سے لائے تازہ آٹے کی تھیلیاں بنائی تھیں۔

میں نے دو بھائیوں کو ایک تھیلی اور باقی تین کو ایک ایک تھیلی دے دی۔ اب صرف ایک بچہ بچ گیا تھا جسے آٹے کی تھیلی نہیں ملی تھی۔ وہ دو بھائیوں میں سے ایک تھا۔ دونوں بھائی ایک تھیلی پا کر چپ رہے۔

باقی تینوں نے ضد کرنی شروع کر دی......

اس کو بھی دیں پلیز اس کو بھی دیں......

دے دیں نا! آپ کا کیا جاتا ہے...... بچہ خوش ہو جائے گا۔ مجھے ان کی تکرار اچھی لگ رہی تھی۔ ویسے بھی لاک ڈاؤن میں کسی سے بات کرنے کو ترسی زبان بات بڑھائے جانے کے حق میں تھی۔ سو میں نے کافی دیر گپ شپ لگا کر ایک تھیلی اسے بھی دے دی۔ سب بچے خوشی خوشی اُچھلتے کودتے چلے گئے۔

بچوں سے تکرار کے چند لمحوں میں...... وقت نے سالوں کا سفر طے کر لیا تھا۔اسی دروازے سے کبھی میری والدہ بھی اس گھر میں داخل ہوئی تھیں۔اُنگلیاں ٹیڑھی آنکھوں کی چمک بھی ماند پڑ گئی تھی۔گھٹنے بھی چلنے سے منکر ہو چکے تھے مگر چہرہ اسی طرح شگفتہ ہاتھ اسی طرح دُعاؤں کے لیے اُٹھے ہوئے۔

کاش وہ اپنے لیے دُعائیں مانگ رہی ہوتیں وہ تو میرے لیے دُعائیں مانگتی ہوئیں اس گھر میں داخل ہوئیں اپنے پوپلے منہ سے میرا ماتھا چوما۔ان ہونٹوں کالمس آج بھی میں اپنے ماتھے پر محسوس کرتی ہوں تو میرا ماتھا مہک اُٹھتا ہے۔وہ جتنے دن رہیں میرے سینے کے ساتھ لگ کر رہیں۔لاؤنج میں بیٹھتی تو میں اپنی ماں کو بچوں کی طرح اُٹھا کر لاؤنج میں لے جاتی، بیڈ روم میں جاتی تو اپنی ماں کو بیڈ روم میں لے جاتی۔دن میں بار ہا چومتی رہتی...... میری ماں کا چہرہ کِھل اُٹھتا اور وہ ہمیشہ کہتیں......اب زندگی کے اس آخری سفر میں مجھے یونہی سینے سے لگائے رکھنا......

اور پھر میرا بھائی اسی گیٹ سے بہار کے اس جھونکے کو میرے خوابوں کا حصہ بنا کر فیصل آباد لے گیا۔

اس نے کہا میری بھی تو ماں ہے......

اور میں روتی بلکتی کئی دن تک گھر کے اس دروازے کو دیکھتی رہی جو آج بھی اسی شان سے کھڑا ہے۔لکڑی کا یہ بے جان دروازہ بے جان نہ ہوتا تو اسے معلوم ہوتا کہ اس دن مجھ پر کیا قیامت گزر گئی تھی......

اور پھر جب میری ماں فیصل آباد سے مجھے پکار کر کہتیں بیٹا کب آؤ گی......

تو میں فوراً کہتی جب آپ آواز دیں گی میں پہنچ جاؤں گی......

میں گاڑی میں پرانے گانوں کی کیسٹ لگاتی اور جونہی کیسٹ ختم ہوتی فیصل آباد آ جاتا......

میری چھوٹی سی گاڑی اور میرے شوہر ہمیشہ میرے ارادوں کا ساتھ دیتے اور میں اپنی ماں کے پاس پہنچ جاتی۔

اِسی دروازے سے ایک دفعہ علوی صاحب میری پھوپھو کو لاہور سے لے کر آئے تو مجھے ہنس ہنس کر بتایا......تمھاری پھوپھو راستے میں موٹروے پر ریفلیکٹرز کو دیکھ کر پوچھ رہی تھیں ساری سڑک

پر بتیاں کیوں جل رہی ہیں؟

اور میں نے ان سے کہا موٹروے والوں کو پتہ چل گیا ہے کہ نعیم کی پھوپھو آ رہی ہیں اس لیے سڑک کو روشن کر دیا گیا ہے۔ وہ چپ تو ہو گئیں مگر سوال کی تشنگی برقرار رہی......

اور پھر اسی دروازے سے نکل کر میں ان سب پیارے رشتوں کو زیرِ زمین سفر کے لیے رخصت کرنے گئی تو دروازے کو بند کر کے یوں تالا لگا کر گئی...... جیسے میرا اور اس کا ہمیشگی کا ساتھ ہے۔

میراں جی کو سوچ ستائے پلک پلک ڈوری لہرائے
قسمت جو بھی رنگ دکھائے اپنے دل میں سمونا ہوگا
بیرن ریت بڑی دنیا کی آنکھ سے ٹپکا جو بھی آنسو
پلکوں ہی سے اٹھانا ہوگا پلکوں ہی سے پرونا ہوگا

والد رحمت اللہ اعوان

یاد کانٹوں کی طرح کھٹکتی ہے سدا۔

سات بہن بھائیوں میں سے والد صاحب چوتھے نمبر پر تھے...... گھر میں بڑے بھائیوں کا بہت رعب اور دبدبہ تھا...... لہٰذا شخصیت کچھ دبی دبی سی تھی...... فیصلہ کر کے اس پر ڈٹ جانے کی کیفیت شاذونادر ہی آتی تھی۔ اکثر اوقات ان کے فیصلوں پر دوست احباب اور رشتے دار اثر انداز ہو جایا کرتے تھے...... جن کی وجہ سے ان کے قریبی لوگ متاثر ہوتے تھے۔ گورنمنٹ ڈگری کالج لاہور میں زیرِ تعلیم تھے کہ رسول انجینئرنگ کالج میں داخلہ مل گیا۔ لہٰذا لاہور کالج چھوڑ کر وہاں چلے گئے دو سال کا کورس ایک سال میں مکمل کر کے بطور سب انجینئر محکمہ انہار میں تعینات ہو گئے۔

فرسٹ ایئر میں ہی تھے کہ شادی کے بندھن میں باندھ دیئے گئے۔ مزاج کھلنڈرا اور حسِ مزاح طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان دونوں عادتوں کی وجہ سے زندگی بہت ہلکی پھلکی اور آرام دہ گزری...... لالچ، طمع اور حسد کا عنصر طبیعت میں نہیں تھا۔ بچپن میں ہاکی کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ حقے سے دوستی اوائل عمری میں ہی ہو گئی تھی۔ چلم بھرنے سے لے کر حقے کو تازہ کرنے کا اہتمام بہت ہی اہتمام سے کرتے تھے۔ تمباکو کی ہر نسل سے واقف تھے۔ اگر کوئی حقہ پینے سے منع کرتا تو جواباً یہ شعر سناتے:

حقہ جو ہے حضور معلٰی کے ہاتھ میں
گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں
ناسخ یہ سب بجا ہے ولیکن تو عرض کر
بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

تیراکی اور گھڑ سواری کا بھی بہت شوق تھا۔ بگڑے ہوئے گھوڑے کی کاٹھی پر سوار ہو کر اسے یوں سدھار لیتے کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے۔ مجلسی طبیعت پائی تھی۔ اکثر و بیشتر محفل جمائے رکھتے۔ مطالعے کا بھی بہت شوق تھا رات کو کتاب پڑھے بغیر نہیں سوتے تھے۔ اردو ڈائجسٹ میگزین تو سالہا سال تک رفیق سفر رہا۔ ہر اچھی کتاب کے متلاشی رہتے۔ شاعری کا بہت اعلیٰ ذوق تھا۔ اچھی شاعری سنتے خیال کی وسعتوں کو سمجھتے اور پھر دوسروں کو سمجھاتے لفظوں کے تہہ در تہہ معنی اور بین السطور مطالب کے بھید کو پا لینے کا ہنر جانتے تھے۔ موسیقی سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ صبح شیو کرنے سے پہلے اکثر ریڈیو سیلون سے ڈوبتی ابھرتی آوازوں میں پرانے گیت بڑے ہی ذوق وشوق سے سنتے۔ اپنے زمانے کی تمام فلمیں اور فلموں کی کہانیاں یاد تھیں۔

ٹی وی پر کُشتی بڑے ہی شوق سے دیکھتے تھے کُشتی دیکھتے ہوئے اتنے مگن ہو جاتے کہ باقاعدہ اس کُشتی کا ایک کردار بن جاتے۔ کبھی کبھی تو اس دھینگا مشتی میں حقہ بھی گر جاتا۔ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتے گرد و پیش بیٹھے لوگوں کی ہنسی چھوٹ جاتی۔ سمجھ تو جاتے کھسیانے سے ہو کر حقہ سنبھالتے کچھ دیر کے لیے تو خاموش بیٹھ جاتے مگر یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہتی۔ حرکت میں برکت کا قصہ دیرینہ وقوع پذیر ہونے لگتا۔

جانوروں سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ ایک دفعہ اسکول سے واپس گھر آتے ہوئے راستے میں پڑے ہوئے کتے کے بچے جو سردی میں ٹھٹھر رہے تھے انھیں اُٹھا کر صافے میں رکھا پگڑی سی باندھی بستہ ہاتھ میں اُٹھایا اور گھر آ گئے۔ گھر والوں کے سامنے سب سے پہلے بستہ رکھا پھر پگڑی اتار کر رکھی تو کتے کے بچے نکل کر بھونکنے لگے۔ ان کتے کے بچوں کو دیکھ کر گھر والوں کی چیخیں نکل گئیں۔

جوانی میں شکار کا بھی شوق رہا۔ ہمیشہ گھر میں تازہ مچھلی پکڑ کر لاتے۔ اہتمام سے پکواتے لطف لے کر کھاتے اور ساتھ ساتھ مچھلی کی قسم پر سیر حاصل تبصرہ بھی کرتے اور بچوں کو کانٹا نکال کر کھانے کی ترکیبیں بھی بتاتے جاتے۔ تیتر اور بٹیر وغیرہ کا بھی شکار کر کے لاتے اور دوستوں کو بلا کر بہت خوش ہو کر کھلاتے۔

انھیں زیادہ باتیں کرنا پسند نہیں تھا اور نہ ہی غیبت کی عادت تھی۔ خاندانی سیاست کے داؤ پیچ

ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ دوسروں کی ضرورتیں اپنی ضرورتیں روک کر بھی پوری کر دیا کرتے تھے۔ بہت سے لوگوں اور اداروں کو ماہانہ پیسے دیتے تھے اور اس میں کبھی غافل نہیں ہوتے تھے۔ لباس کے معاملے میں بہت لاپرواہ تھے، گھر میں شلوار قمیض اور کبھی کبھی دھوتی اور بنیان بھی پہن لیتے تھے...... باہر جاتے ہوئے اکثر پینٹ کوٹ پہنتے تھے۔ دفتر چھوڑا تو پینٹ کوٹ پہننا بھی چھوڑ دیا......

چونکہ پاکستان بنتے دیکھا تھا لہٰذا پاکستان سے بے انتہا محبت تھی۔ اکثر و بیشتر ہمیں پاکستان بننے کی کہانیاں سناتے۔

مشرقی پاکستان الگ ہوا تو بہت عرصہ سوگوار رہے۔ کشمیر کو رگِ جاں کے قریب سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے کہہ دیا کہ ہم لوگ مشرقی پاکستان کو تو سنبھال نہ سکے کشمیر کیا آزاد کرائیں گے۔ کشمیر کو بھول کر امن چین سے زندگی گزارنی چاہیے۔ اتنا غصہ آیا کہ جوتا لے کر اسے مارنے کے لیے اس کے پیچھے بھاگے...... یہ بات بتانے والی تو نہیں خیر سن لیجیے وہ میں ہی تھی جس نے بڑی مشکل سے جان بچائی۔

تاریخ اور جغرافیے سے بہت دلچسپی تھی۔ تاریخی واقعات خصوصاً اسلامی تاریخ کے واقعات پر بات ہوتی تو وقت کا احساس نہ رہتا۔ رات بیت جاتی مگر نہ واقعات کا تسلسل ختم ہوتا نہ دلچسپی میں کوئی کمی آتی اور نہ ہی کسی کو محفل سے اُٹھنے کی ہمت ہوتی...... مطالعہ وسیع تھا، عموماً واقعات کا تقابلی جائزہ بھی لیتے۔ گفتگو میں اگر کوئی ٹھوس دلائل سے بات کرتا تو اس کی بات مان جاتے۔ بے جا بحث نہیں کرتے تھے...... کسی بھی ملک کی بات ہوتی، ہمیشہ نقشے پر اس ملک کا حدود اربعہ سمجھاتے۔ گلوب اٹلس اور نقشے وغیرہ خریدنے کا بہت شوق تھا۔

میرا معمول تھا کہ میں جب بھی والد صاحب سے ملنے جاتی اپنے موبائل میں ان کی پسند کی غزلیں نظمیں پرانے گیت بُلھے شاہ اور سلطان باہو کا عارفانہ کلام بڑی محنت سے جمع کر کے لے جاتی......اور پھر انھیں سنا کر لطف لیتی...... وہ بہت محظوظ ہوتے اور ساتھ ساتھ اس کا مطلب بھی سمجھاتے۔ ہم دونوں باپ بیٹی تہہ در تہہ لفظوں کے معنی تلاش کرتے، اس پر گفتگو کرتے اور کچھ دیر

کے لیے بیماری کو بھول جاتے۔ان کو یہ چیزیں سنانے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔

دین محمد قوال کی قوالیاں بڑے ہی شوق سے سنتے تھے...... دین محمد نے چند قوالیاں ہی گائیں اور پھر جوانی میں ہی اس جہاں سے کوچ کر گیا۔ جب وہ قوالی کے انداز میں یہ قوالی گاتا......

تیرے مگر نہیں جانا...... تینوں کہندا یار پرانا...... کھڑی ہو کے گل سن جا

چھڈ کے مینوں وچ اجاڑاں...... آپ تاں ملیاں باغ بہاراں

مینوں دس جا کوئی ٹکانہ...... کھڑی ہو کہ گل سن جا

اگے روز مرے گھر آویں...... نال محبت سینے لاویں

تینوں بھل گیا اوناں جاناں...... تینوں کہندا یار پرانا...... کھڑی ہو کے گل سن جا

اس قوالی کو سنتے...... جھومتے...... بلند آواز میں واہ واہ کرتے اور مجھے سمجھاتے۔ یہ روح اور بدن کی کہانی ہے روح جب بدن سے پرواز کرتی ہے تو بدن روح کو پکارتا ہے...... دین محمد کو والد صاحب کی تشریح اور تفسیر کے ساتھ سننے کا لطف ہی کچھ اور تھا......

ایک انڈین گلوکار رمتا سنگھ کو بھی بہت خوش ہو کر سنتے تھے......

عورتوں کی تعلیم کے حق میں نہیں تھے...... اکلوتی بیٹی ہونے کے باوجود تعلیم کے معاملے میں کبھی میری حوصلہ افزائی نہیں کی اور نہ ہی کبھی میری کسی تحریر پر مجھے شاباش دی۔ شاید دل میں خوش ہوتے ہوں لیکن کبھی اس کا اظہار نہیں کیا...... میں ہمیشہ زبردستی اپنی کہانیاں سنا کر رائے پوچھتی اور وہ ہمیشہ اپنے مخصوص انداز میں ٹال دیا کرتے تھے...... ارے بھئی ذرا حقہ تو قریب کر دو...... یا پھر...... جاؤ میرے لیے چائے بنا کر لاؤ...... وہ لاکھ کوشش کے باوجود کبھی ایک جملہ بھی نہیں کہتے تھے...... ہوسٹل میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے کے سخت مخالف تھے...... میں اپنی بات منوانے کے لیے اکثر رُوٹھ جایا کرتی تھی اور پھر وہ میری ضد کے آگے ہتھیار ڈال کر میری بات مان لیا کرتے تھے۔

موت کے فلسفے پر میری اکثر ان سے بات ہوتی...... ایک دفعہ میں نے پوچھا موت سے ڈر لگتا ہے کہنے لگے موت سے تو نہیں قبر کے عذاب سے ڈر لگتا ہے۔ میں نے کہا میرا دل تو نہیں مانتا کہ قبر کا عذاب ہوگا۔ کیونکہ اللہ نے حساب کتاب کے لیے حشر کا میدان مقرر کیا ہے۔ حشر سے پہلے

تک انسان ملزم ہوگا مجرم نہیں۔لہٰذا سزا بھی مجرم کو ملتی ہے ملزم کو نہیں۔بات دل کو لگتی اور مسکرا دیتے۔

پھر میں کہتی علامہ اقبالؒ نے تو موت کو تجدید مذاقِ زندگی کا نام دیا ہے اور غالب کی شان بے نیازی دیکھیے ایک دوست کو تعزیت کے لیے خط لکھا تو پہلے حال احوال پوچھا ادھر اُدھر کی باتیں کیں اور آخر میں ایک جملہ لکھ دیا۔

موت کا غم تو وہ کرے جس نے خود نہ مرنا ہو۔

میں اکثر موت کا غم دور کرنے کے لیے انھیں حفیظ جالندھری کا شعر سناتی:

زندگی میں تو کوئی چیز انوکھی نہ رہی
موت ہی ایک نئی بات نظر آتی ہے

حفیظ جالندھری نے کس زاویے سے موت کا جائزہ لیا ہے......میں کہتی......یعنی زندگی کو تو بھرپور طریقے سے دیکھ لیا اس میں کوئی نیا پن نہیں رہا اب نیا پن ہے تو صرف موت میں ہے۔ زندگی کے بھید تو کھل گئے اب موت ہی ایسا اسرار ہے جس کا انتظار ہے۔پھر ہم باپ بیٹی اس تجربے سے گزرے ہوئے تمام لوگوں کو یاد کرتے اس منظر کشی میں تمام وفات پا جانے والے کرداروں کو ہم اپنی گفتگو کے آئینے میں زندہ کر لیتے۔یوں محسوس ہوتا جیسے وہ وہاں محفل جما کر بیٹھے اپنے باقی رشتے دار دوست احباب کا انتظار کر رہے ہیں......فلاں یہ کہے گا اور فلاں وہ کہے گا۔وہ دوزخ سے جھانک رہا ہوگا وہ جنت کے مزے لوٹ رہا ہوگا۔

میں اکثر مکیش کا گانا سنواتی:

دنیا بنانے والے کیا تیرے من میں سمائی......کاہے کو دنیا بنائی تُو نے کاہے کو دنیا بنائی

بہت شوق سے سنتے اور پھر کہتے انشاء جی والی نظم سناؤ۔میں وہ لگا دیتی کبھی عابدہ پروین کا عارفانہ کلام سناتی......کبھی وہ مجھے شعر کے اسرار و رموز سمجھاتے اور کبھی میں انھیں بتاتی......

چونکہ مجلسی انسان تھے آخری دم تک مجلسی ماحول میں رہے......موت کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار تھے اکثر مجھے کہتے......ہن نیڑے نیڑے کم پہنچ گیا ہے......تکلیف برداشت کرنے کا حوصلہ بہت تھا۔طویل بیماری کا مقابلہ بڑے ہی صبر سے کیا......ہائے نہ اوئی......وقت کے ساتھ ساتھ

زندگی بدلتی تو بدلی ہوئی زندگی قبول کر لیتے اور خود بھی بدل جاتے۔

والد صاحب کی چوراسی سالہ زندگی خواب وخیال کی منڈیر پر کھڑی بادل کی طرح گرجتی اور برکھا کی طرح برستی ہے۔ دل ودماغ میں گم گشتہ بہاریں...... یادوں کے دریچے سے جھانکتی ہیں تو آنکھوں میں جگنو سے چمکنے لگتے ہیں۔

اور پھر وہ جس کا انتظار تھا...... تیس ستمبر کو آئی گلے لگایا آنکھیں موندیں...... ہچکی لی اور چل دیے......

آپاں وزیر بیگم

(مارچ سے شروع ہونے والی وبائی مرض کورونا کا پھیلاؤ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔خوف ہے کہ ختم ہی نہیں ہو رہا۔ جو لوگ اس موذی مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسی ایسی دردناک کیفیت کا ذکر کرتے ہیں کہ خوف دو چند ہو جاتا ہے۔۲۰۲۱ شروع ہو گیا ہے۔ جنوری بھی گزرتا جا رہا ہے...... مگر کورونا بدستور خوف و ہراس کا مرکز بنا ہوا ہے۔ وہ قوم جو دہشت گردی بم دھماکوں سے خوف زدہ نہیں ہوئی۔اس نے اس چیلنج کو بھی پوری طرح اپنے او پر وارد نہیں ہونے دیا۔زندگی کا سلسلہ چل رہا ہے۔ ڈرنے والے ڈرتے ہیں۔ احتیاط کرنے والے احتیاط بھی کرتے ہیں مگر کچھ لوگوں کی کیفیت ایسی ہے کہ ”میں نہ مانوں رے“

جنوری کا مہینہ میرے لیے بہت خاص ہوتا ہے۔آج میری سوچوں کا مرکز صرف اور صرف میری ماں ہے۔اسی مہینے میں نے اپنی بہت پیاری رگِ جاں کے بھی قریب اس ہستی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت کیا تھا۔ظہورِ زندگی کے ساتھ ہی ماں کی قربت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بچے کا ماں کے ساتھ رشتہ...... ماں کے وجود کے اندر رہ کر قائم ہوتا ہے اور جب وہ اس کائنات میں آنکھ کھولتا ہے تو شیر مادر ہی اس کے وجود کی نشو نما کا پہلا سبب بنتا ہے۔ بچہ بڑا ہو کر اپنی افتادِ طبع کے مطابق اپنی بقا کی جنگ میں مصروف ہو کر ماں سے بھلے ہی غافل ہو جائے......مگر ماں کی آنول نال کٹ کر بھی جدا نہیں ہو پاتی۔)

امی کا خاندان انڈیا کے قصبے پھول پور میں بہت اعلیٰ خاندان سمجھا جاتا تھا۔میرے نانا پڑھے لکھے تھے اور گورنمنٹ ملازم تھے۔انھیں سرکاری طور پر سفر کے لیے گھوڑی ملی ہوئی تھی۔امی کو اپنے خاندان کے اعلی و ارفع ہونے پر بہت فخر تھا اور اکثر و بیشتر اس کا اظہار بھی کیا کرتی تھیں۔

مولانا غلام رسول مہر رشتے میں ان کے چچا لگتے تھے۔ میرے نانا کے ساتھ ان کی بہت دوستی تھی اور وہ ان کے بہت قریب تھے۔ ہمیشہ ان کا نام فخر سے لیا کرتیں اور ان کی زندگی کے بے شمار واقعات سنایا کرتی تھیں جو مجھے آج بھی یاد ہیں۔ امی سنِ بلوغت کو پہنچیں تو ان کا رشتہ طے کر دیا گیا۔ وہ لڑکا اس زمانے میں انجینئر تھا۔ (یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے۔) اُس لڑکے کے خاندان کا شمار جالندھر کے رؤسا میں ہوتا تھا۔

منگنی کے بعد سسرالی خاندان کی کسی دوسرے خاندان کے ساتھ لڑائی ہو گئی۔ دونوں خاندانوں نے خواتین کی بے حرمتی کی جس کی وجہ سے میرے نانا نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ ان دنوں پاکستان بننے کی تحریک زوروں پر تھی۔ اس تحریک کے دوران ہی میرے نانا کا انتقال ہو گیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد یہ خاندان فیصل آباد کے پاس جڑانوالہ میں آ کر آباد ہو گیا۔ بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں مگر میری والدہ جو گھر میں بڑی سمجھدار اور سلجھی ہوئی خاتون تھیں ان کو اندرونِ خانہ تمام ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ بھابیوں کی موجودگی میں بھی گھر میں میری والدہ کی چودھراہٹ چلتی تھی۔ اس اثناء میں کوئی ہم پلہ رشتہ نہ ملا اور یوں بہت سا وقت گزر گیا۔ ایک دن میری نانی کو کسی نے احساس دلایا کہ تم اپنی بیٹی کے ساتھ زیادتی کر رہی ہو اس کی شادی کرو۔ اس کا مشورہ میری نانی کے دل پر اثر کر گیا اور انھوں نے میری والدہ کے لیے مناسب رشتہ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ میرے دادا کو خبر ہوئی تو انھوں نے اپنے بیٹے کا رشتہ دے دیا۔

میرے والد ابھی فرسٹ ایئر میں تھے۔ میری والدہ سے عمر میں کافی چھوٹے تھے۔ میری نانی عمر کے اس فرق کہ فیصلے پر مطمئن نہیں تھیں۔ گھر میں کوئی بزرگ نہیں تھا۔ امی کے بھائیوں کو اس رشتے پر بہت اعتراض تھا۔ لہٰذا وہ اس رشتے کے لیے کسی صورت نہیں مانتے تھے۔ میرے داد اس وقت امی کے چاچا غلام رسول مہر کے پاس چلے گئے اور انھیں رشتے پر قائل کر لیا۔ خاندان میں ان کی بات کوئی نہیں ٹال سکتا تھا اور یوں یہ رشتہ مولانا غلام رسول کے ایما پر طے ہو گیا۔

امی بھرے گھر کی چودھراہٹ چھوڑ کر ایک بے روزگار اور کم عمر شوہر کے ساتھ بیاہ کر شہر سے دور ایک پسماندہ گاؤں میں آ گئیں۔ یہاں انھیں ایک بھرا گھر اپوزیشن کی صورت میں ملا۔ بڑی عمر

کے طعنے دیے گئے۔ دیہاتی زندگی میں ڈھلنا پڑا اور کم عمر غیر سنجیدہ اور کھلنڈرے لڑکے کے ساتھ جیون بتانے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا پڑا...... یقیناً بہت مشکل دور ہوگا۔

اعوان قبیلہ تو بہت جنگجو اور نڈر قسم کی خصوصیات کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ ہماری عورتیں اکثر اپنی صفات سے متصف ہوتی ہیں۔ امی نے اپنے ماں باپ کا ہرا بھرا گھر چھوڑا تو کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ جب تک میرے دادا زندہ رہے۔ وہ ڈھال بن کر امی کی حفاظت کرتے رہے۔ شادی کے دو سال بعد اللہ نے امی کی گود میرے ننھے منے وجود سے ہری کر دی اور یوں امی کی زندگی میں قرار آ گیا۔ میری والدہ نے والد کو بھی سنجیدگی سے پڑھائی کی طرف راغب کیا۔ میرے والد نے سول انجینئرنگ میں ڈپلومہ کیا اور یوں میری آمد کے ساتھ ہی انھیں نوکری بھی مل گئی جو ایک اچھا شگون سمجھا جانے لگا۔

امی کہا کرتی تھیں تمھاری آمد کے بعد گھر میں لہر بہر ہوگئی۔ رزق کی فراوانی ہوئی اور حالات بدل کر رہ گئے...... اس زمانے میں محکمہ انہار کی نوکری کی بہت شان ہوتی تھی۔ گھر بنگلہ، بنگلے کے ساتھ زمین، نوکر چاکر...... محکمہ انہار کی ملازمت میں ناجائز پیسے کی بہت گنجائش تھی۔ میرے والد کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ بیوی کی بڑی عمر اور والدین کو تنخواہ کا ایک معقول حصہ ماہوار بھیجنا جیسے پریشر بھی تھے۔ دوسری شادی کے پرکشش خیالات بھی موجزن رہتے تھے۔ میری والدہ بہت ہی نفیس، سمجھدار، دین دار، کفایت شعار اور سلیقہ مند خاتون تھیں۔ پڑھی لکھی نہ تھیں مگر اس زمانے کے حساب سے قرآن باترجمہ پڑھ لیتی تھیں۔ اپنا نام بھی لکھ لیتی تھیں اور اس پر ناز بھی کرتی تھیں۔ بہشتی زیور ہی ان کا نصابِ زندگی تھا جو انھیں ازبر تھا۔ دین ان کے انگ انگ میں رچا بسا تھا۔ امی نے زندگی میں بہت مصائب دیکھے بلکہ یوں کہنا چاہیے مصائب بھری زندگی گزاری...... مگر دین کی پختگی میں کبھی فرق نہیں آیا۔ بہت پُر اُمید رہتی تھیں۔ دُعا قبول نہ ہوتی......تو عبادت میں اضافہ کر دیتیں۔ ایسی صورت میں ان کا خیال تھا کہ شاید میں بہت گنہگار ہوں اللہ اس لیے میری نہیں سنتا......

زندگی کے اُتار چڑھاؤ میں میری والدہ نے نہ صرف یہ کہ والد صاحب کو راہِ راست پر رکھا بلکہ حرام کی کمائی کا ایک پیسہ بھی گھر میں نہ آنے دیا۔ کفایت شعاری سمجھداری اور دور اندیشی سے

معاملات کو سنبھالا۔ خدا نے تین بچوں سے نوازا۔ ہم تینوں کی تربیت میں بھی والدہ کا بہت اہم کردار رہا۔ تعلیم و تربیت کے حوالے سے بہت سخت گیر ماں تھیں۔ بہت ہی رعب اور دبدبہ تھا۔

ختم، درود، نماز اور روزے کی بہت پابند تھیں۔ ہر مہینے گیارھویں کا ختم دلایا جاتا۔ جس میں آدھی دیگ کھیر کی بنتی۔ جس میں تقریباً چودہ پندرہ کلو خالص دودھ ڈالا جاتا اور پھر وہ کھیر غریبوں میں بانٹ دی جاتی۔

ہمارے گھر لسی لینے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ اکثر لوگ دودھ مانگنے بھی آجاتے کلو آدھ کلو دودھ تو یونہی اڑوس پڑوس والے مانگ کر لے جاتے۔ گھر میں جانور پالنے کا بہت شوق تھا...... مرغیاں انڈے بکریاں اور بھینسیں ہر زمانے میں ہوا کرتی تھیں۔

بقر عید پر گھر کے پالے ہوئے جانوروں سے ہی بکرے منتخب کر کے قربانی دی جاتی۔

قرآن پڑھنے کی رفتار بہت سست تھی مگر بہت دلجمعی سے قرآن پڑھتی رہتی تھیں۔ ہر جمعے کو صلوٰۃ تسبیح اور سورۃ کھف ضرور پڑھا کرتیں۔ دُعائے تنجینا کا ہر وقت ورد کیا کرتیں۔ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اولاد کی تربیت سے غافل نہیں ہوتی تھیں۔ جو بچہ فجر کی نماز کے لیے نہ اٹھتا اسے سارا دن امی کے غیض و غضب کا شکار ہونا پڑتا۔

ہمارے گھر میں محرم بھی باقاعدہ منایا جاتا۔ نیاز بانٹی جاتی۔ امی اکثر محرم کے دس روزے رکھا کرتی تھیں اور شامِ غریباں کا پروگرام ٹی وی پر ضرور دیکھتیں...... سنتے ہوئے زار و قطار رویا بھی کرتی تھیں۔ اب میں سوچتی ہوں مذاہب کے درمیان کتنی ہم آہنگی تھی۔ امام حسین علیہ السلام اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر صرف اہلِ تشیع کی اجارہ داری نہ تھی۔

میرے والد کو کبھی رشوت کی دلکشی میں گم نہ ہونے دیا۔ انتہائی سگھڑ تھیں، بڑے ہی سلیقے سے گھر چلاتیں تھیں۔ اپنے کپڑے خود سیتی تھیں۔

کھانا اتنا عمدہ پکاتی تھیں کہ آج بھی منہ میں ان کے کھانوں کا ذائقہ محسوس کرتی ہوں۔ ان کا پلاؤ...... قیمہ بھرے کریلے، آلو گوشت بہت مشہور تھا۔ ہمارے گھر میں گندم دھونے کے بعد پسوائی جاتی تھی۔ ہانڈی کے لیے مصالحہ روز تازہ پستا تھا۔ کئی قسموں کی مٹھائیاں گھر میں بنتی تھیں۔ خاص طور پر کچی ہلدی کی مٹھائی...... نشاستے اور السی کی پنیاں...... بے شمار قسم کے حلوے بناتی تھیں......

اور اکثر چھپا کے رکھتی تھیں کیونکہ بچے پھر کچھ اور نہیں کھاتے تھے۔حلوؤں پر ہی ہاتھ صاف کرتے رہتے تھے۔مزے کی بات یہ کہ جب کوئی حلوہ تھوڑا خراب ہونے لگتا تو پھر زبردستی کھلایا جاتا اور کھلے عام دسترخوان پر رکھ دیا جاتا۔

نشاستہ اور سویاں گھر میں بنتی تھیں۔اکیس دن گندم کو گھر میں بھگویا جاتا......اس میں انتہائی سڑاند آتی۔پھر اس گندم کو چارپائی پر کپڑا ڈال کر سکھایا جاتا۔اس میں سے جو پاؤڈر نکلتا وہ نشاستہ کہلاتا۔اتنے لذیز اچار بنایا کرتی تھیں کہ لوگ اُنگلیاں چاٹتے رہ جاتے اور پھر وہ اچار خاص خاص لوگوں میں تحفتاً بھیجا جاتا۔میں جب ہوسٹل میں ہوا کرتی تھی تو میس بند ہونے کی صورت میں میری اور میری سہیلیوں کی مرغوب غذا اچار اور اُبلے چاول ہی ہوا کرتی تھی۔

سویاں بنانے کی مشین گھر میں تھی۔اس سے طرح طرح کی سویاں بنتی تھیں جنھیں چارپائی کھڑا کر کے اس پر صاف کپڑا ڈال کر لٹکایا جاتا اور سوکھنے پر اُتار لیا جاتا۔ایک بہت ہی منفرد عادت تھی اڑوس پڑوس میں دوستوں کو عید بھیجا کرتی تھیں۔سویاں بیسن چینی سوجی چوڑیاں اور مہندی کے پیکٹ بناتیں اور پھر ان پیکٹوں کو اہتمام کے ساتھ سہلیوں میں بانٹا جاتا۔

معمولاتِ زندگی میں نماز اور روزانہ تلاوت قرآن کی بہت پابند تھیں۔لہٰذا تفریح کے لیے کبھی وقت نہیں نکال پاتی تھیں۔اس زمانے میں تفریح کا کوئی دستور بھی نہیں تھا۔میرے والد بہت مہمان نواز تھے۔ان کے بارے میں امی کہا کرتی تھیں تمھارے والد تو صبح اُٹھ کر چوک پر کھڑے ہو جاتے ہیں جو بھی ملے اسے گھر کھانا کھلانے لے آتے ہیں۔

بعض دوست تو مستقل امی کے غیض وغضب کا شکار ہوتے تھے مگر پھر بھی ان کی مستقل مزاجی میں کبھی فرق نہیں آیا کرتا تھا۔یہ دوست امی کو یوں بھی بُرے لگا کرتے تھے۔کیونکہ یہ سب تاش کھیلنے کے دوست تھے۔ان مہمانوں کو کھانا تو کھلایا جاتا مگر خوشدلی سے نہیں......اکثر اس بات پر گھر پانی پت کا میدان بن جایا کرتا تھا مگر نہ ابو نے کبھی اپنی خو چھوڑی اور نہ ہی امی نے طرزِ ملامت......

ہمارے گھر میں جمعہ کا دن بہت خاص ہوتا تھا۔ایک طرف بڑے تسلے میں سوڈا کاسٹک اور صابن اُبلنے کے لیے رکھ دیا جاتا۔جس میں سفید کپڑے ڈال کر انھیں تھاپی سے کوٹ کوٹ کر دھویا

جاتا۔ دوسری جگہ چولہے پر کلف بنتی اور سفید براق کپڑوں پر کلف لگتی۔ تمام بیڈ کوور بدلے جاتے اور پھر خاص کھانا پکتا۔ جمعے کی نماز سے پہلے امی دنداسہ ملتیں، صاف کپڑے پہنتیں، سرمہ لگاتیں ان کا خیال تھا سرمہ لگانا سنت ہے۔ اس کے علاوہ عطر بھی ضرور لگایا کرتیں...... ابو اور بھائی بھی کلف لگے کپڑے پہن کر جمعہ پڑھنے جاتے۔ خود وہ گھر میں جمعہ پڑھا کرتی تھیں۔

انھیں کپڑے رنگنے کا بہت شوق تھا۔ اپنے پرانے کپڑے بیڈ کور اور دوپٹوں کو اکثر رنگنے کے بعد انھیں نیا بنا لیتی تھیں۔ ایک ہی دوپٹہ کبھی نیلا کبھی پیلا اور آخر میں کالا...... اکثر تولیوں کو بھی رنگ لیا کرتی تھیں۔ رنگے ہوئے تولیے بسا اوقات جسم کو بھی رنگ رنگیلا کر دیا کرتے تھے جس سے میرے والد سخت ناراض ہوتے اور امی رنگ بیچنے والے کو بُرا بھلا کہتی ہوئیں کسی اور دُکان کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتیں۔

یہ ساری مصروفیات جوڑوں کی تکلیف کے ساتھ تھیں۔ زندگی بھر ان کے پاس ملازم رہے۔ جانوروں کے لیے الگ...... گھر کے کاموں کے لیے الگ۔ بچوں کو بھی کام کاج میں لگائے رکھتیں۔ البتہ ابو پر کبھی بس نہ چلتا اور وہ اپنی زندگی بے فکری سے گزارتے۔

شدید غصے والی طبیعت تھی۔ کبھی اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہوتی تھیں۔ ہمیشہ منہ پر بات کرتیں اور بڑے دھڑلے سے کرتیں، چاہے کسی کو کتنا بھی بُرا لگے انھیں اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ احساس دلائے جانے پر کہا کرتیں ''خدا لگتی کہی کوئی ناراض ہو تو ہو۔''

ایک دفعہ میرے والد کو اُن کے بہن بھائیوں نے بہلا پھسلا کر منا لیا اور ان کا ان کی انتہائی حسین ماموں زاد سے تقریباً رشتہ طے کر دیا۔ میرے والد کی ماموں زاد اتنی حسین تھیں کہ ان کے بارے میں میرا بھائی بڑا ہو کر کہا کرتا تھا ''کیا یہ پھوپھو بھی مرنے کے بعد مٹی میں دفن ہو جائیں گی۔'' امی کو پتہ چلا تو انھوں نے ابو کو بٹھا کر اپنی زبان میں سمجھایا...... کیا کمی ہے مجھ میں...... نافرمان ہوں...... یا تمھیں بچے نہیں دیے۔ تم کیا سمجھتے ہو میں تمھیں آسانی سے دوسری شادی کرنے دوں گی۔ اگر تم نے آسمان میں چھپنے کی کوشش کی تو میں تمھیں ٹانگوں سے کھینچ کر زمین پر لے آؤں گی اور اگر زمین میں پناہ لینے کی کوشش کی تو میں تمھیں بالوں سے کھینچ کر باہر نکالوں گی۔''

پھر ایسی زبردست تحریک چلائی کہ ابو کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

لگی لپٹی رکھنا یا کسی کا منہ ملاحظہ رکھنا انھوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ ایک دفعہ میرے گھر آئیں تو کسی سے ملنے کا اظہار کیا میں انھیں ان کے گھر لے گئی...... گھر والوں نے دو گلاس کوک کے پیش کیے...... جس میں انھوں نے شاید پورا نہ ہونے کی وجہ سے تھوڑا پانی ملا دیا...... امی سے رہا نہ گیا کہنے لگیں بہن کوک میں پانی ڈالا تھا تو تھوڑا نمک بھی ڈال دیتیں حلق سے تو اُتر جاتی۔ ان کے سامنے کوئی بھی ڈینگیں نہیں مار سکتا تھا۔ بلا لحاظ اور بلا امتیاز ایسی طبیعت صاف کرتیں کہ اس کی سات پشتیں یاد کرتیں۔

کانوں میں ہمیشہ چنبیلی کے پھول سجاتی تھیں اور کلائیاں کبھی چوڑیوں سے خالی نہ ہوتیں۔ کسی کے گھر جانا ہو تو صبح سے ہی تیاری شروع ہو جاتی۔ دنداسہ ملنے سے لے کر بالوں کے رنگنے تک کے تمام مدارج طے کیے جاتے۔ پھول کی طرح مہکتی ہوئی تیار ہوتیں۔ عشقِ رسولؐ سے لبا لب بھری ہوئیں تھیں۔ میلاد کی محافل میں خصوصی طور پر شرکت کیا کرتیں۔ آواز بہت ہی پیاری تھی اکثر نعتیں ترنم سے پڑھا کرتی تھیں۔

شاہِ مدینہ یثرب کے والی، سارے نبی تیرے در کے سوالی...... ان کی پسندیدہ نعت تھی۔

کھڑے ہو کر سلام پڑھتیں اور نبیؐ کے تصور سے آنکھیں پُرنم ہو جاتیں۔ موت کا خوف نہیں تھا۔ اچانک کسی فوتگی کی اطلاع پر میں نے کبھی ان کے ہاتھ پاؤں پھولتے نہیں دیکھے۔ بڑے حوصلے ہمت اور استقامت سے اپنا کام نبٹاتیں۔ کپڑے بدلتیں کنگھی کرتیں اور پھر تسلی سے گھر سے نکلتیں مگر فوتگی والے گھر جا کر اس طرح روتیں جیسے سب سے زیادہ دکھ انھی کو ہے۔ اکثر کہا کرتی تھیں موت کا خوف کیسا سب نے مرنا ہے۔

امی کی چھوٹی ممانی سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ انھوں نے ماموں کو سارے خاندان سے الگ کر لیا ہے اور یہ سچ بھی تھا...... جب ماموں بیمار ہوئے تو امی کئی دفعہ ہسپتال ملنے کے لیے گئیں مگر ممانی نے ملنے نہ دیا۔ ماموں بھی امی کو یاد کرتے رہے مگر میری والدہ بستر مرگ پر پڑے بھائی سے کسی صورت نہ مل سکیں۔ ماموں امی سے چھوٹے تھے لہٰذا امی کو ان سے بہت پیار تھا۔ ماموں فوت ہو گئے تو امی نے ان کے فوت ہونے کی خبر خاموشی سے سنی۔ ہم جانتے تھے یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ ہم نے باری باری امی کو سمجھایا کہ اب ماموں کے گھر جا کر کچھ

مت کہیے گا۔بس خاموشی سے کچھ دیر بیٹھ کر آ جایے۔امی نے سب کی بات تحمل سے سنی۔ مجھے گھر والوں کی طرف سے ہدایت ملی کہ میں امی کے ساتھ ساتھ رہوں اور امی کو کچھ بھی بولنے سے باز رکھوں......جونہی امی ماموں کے گھر پہنچیں۔میت کے پاس بیٹھ گئیں اور با آواز بلند ممانی کی زندگی کا وہ شجرہ نسب پیش کیا کہ خدا کی پناہ۔ممانی تو کہیں کمرے میں چھپ گئیں اور میں بھی خوفزدہ ہو کر متعلقہ جگہ سے کھسک گئی۔ کیونکہ گھر والوں کا مشورہ میرے لیے انتہائی مضر ثابت ہو سکتا تھا۔بھری محفل میں کسی کی جرأت نہیں تھی کہ امی کو چپ کرا سکتا۔بس پھر کیا تھا سب نے یہی طے کیا کہ جلدی سے میت کو اُٹھا لیا جائے۔

میرے چھوٹے ماموں شہر کے چودھری تھے۔آڑھت کا کاروبار کرتے تھے اور پیسے کی ریل پیل تھی۔ بڑی دھوم دھوم سے الیکشن لڑا کرتے تھے اور ہر دفعہ جیت بھی جاتے تھے۔الیکشن کے دوران ہمارا سارا خاندان اس تحریک میں شامل ہوتا۔امی اپنا ووٹ ڈال کر آئیں تو میرے ماموں زاد نے کہا آپاں، امی کو سب آپاں کہتے تھے۔اپنے بھائی کی محبت میں ایک اور ووٹ ڈال دیں جو شناختی کارڈ امی کو دیا اس کے مندرجات میرے والد سے ملتے جلتے تھے مگر وہ شخص فوت ہو چکا تھا۔ پہلے تو امی کو سمجھ نہ آئی جب پورے طریقے سے سمجھ آئی تو......

اب ذرا تصور میں وہ ماحول لائیے۔الیکشن والا گھر لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا۔امی نے جوتا اٹھا لیا اور بھتیجے کے پیچھے اسے مارنے کے لیے دوڑیں۔ساتھ ساتھ دلکش لفظوں کی ترتیب کے ساتھ کہتی جاتیں......ایک ووٹ کے لیے مجھے کسی اور کی ''رن'' بنانا چاہتے ہو۔تمہارے الیکشن کی ایسی تیسی، بے ایمانی کا منہ کالا......بھتیجے نے تو بھاگ کر جان چھڑا لی مگر ماموں زد میں آ گئے......مگر وہ ہنستے رہے اور سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں بھی گالیاں کھا کر بدمزہ نہ ہوئے۔بڑی مشکل سے امی کا غصہ ٹھنڈا کیا۔امی کی زندگی ایسی بے شمار مثالوں سے بھری ہوئی تھی۔

بہت سنجیدہ طبیعت تھیں حسِ مزاح بالکل نہیں تھی۔میرے والد میں حسِ لطافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔لہٰذا وہ امی کے ساتھ مذاق کر کے گھنٹوں اس کا لطف لیتے مگر وہ کبھی بھی سمجھ نہ پاتیں کہ یہ جملہ تو انھوں نے مذاق میں کہا ہے......کہا کرتی تھیں ''مجھے ٹچکریں کرتا رہتا ہے۔'' یہ ٹچکروں کا لفظ میں نے انہی سے سنا تھا......ان کے بعد کبھی کسی سے نہیں سنا۔

اپنے حسب ونسب پر ہمیشہ فخر کرتیں اور دلچسپ قصوں کی صورت ہمیں سنایا کرتی تھیں۔ آخری عمر میں جب بستر پر چلی گئیں اور چلنے پھرنے کے قابل نہ رہیں تو ہر وقت ہاتھ میں تسبیح ہوتی اور اپنی اولاد کے لیے اللہ سے خیر مانگتی رہتیں۔ میں اکثر کہتی...... امی جان اب اپنے لیے دُعا مانگا کریں...... مگر وہ آخر دم تک اولاد کے لیے ہی دُعائیں کرتی رہیں۔

آہ!

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

کھٹا میٹھا زمانہ

کھڑکی کے اس پار دیکھتے دکھاتے زندگی کے وہ پہلو آتے رہے جو حقیقت کے بہت قریب تھے......سو لوگ سوگوار ہوئے۔ انھوں نے مطالبہ کیا نعیم بس کرو اتنا نہ رُلاؤ......

تو......چلیے آج کچھ اور سوچتے ہیں......

پچیس اپریل کی شام دھواں دھار بارش میں موسم کا رنگ ڈھنگ کچھ یوں بدلا...... کہ ہر طرف اندھیرا سا چھا گیا......اس اندھیرے ماحول میں تیز آندھی اور اولے برسنے لگے۔ کھڑکی سے باہر کھڑی گاڑیوں کو چھوٹی چھوٹی سفید برف کی گولیوں نے ڈھک لیا۔ اپریل کے مہینے میں ایسی بارش کبھی نہ دیکھی تھی۔ سو آج وہ بھی دیکھ لی۔

دھوپ کی تمازت سے گرم کپڑوں کی جگہ باریک ململ کے کپڑے اور کپڑوں پر گرم شال...... فراغت کے ان لمحوں میں صحت اچھی ہو، ٹیکنالوجی کی نئی دنیا سے دوستی بڑھا رکھی ہو تو زندگی جنت سے کم نہیں ہوتی۔

میری نظریں باہر تھیں۔ ہاتھ میں پی ٹی سی ایل کا فون......فون پر من پسند دوستوں کے ساتھ گفتگو......

دوسرے ہاتھ میں موبائل فون......اور موبائل فون پر دنیا جہان سے رابطہ......

فیس بک پر اہلِ قلم کی نگارشات۔ مزاحیہ شاعری، افسانے، کہانیاں، لطیفے، ویڈیوز، درد بھری غزلیں، نظمیں، مکالمے، ذہانت بھرے تبصرے اور تبصروں میں جھلکتی دوستوں کی شخصیتیں اور شخصیتوں کی کھلتی پرتیں اور پرتوں سے جھلکتے رویے اور رویوں سے بنتے بگڑتے، سلتے ادھڑتے، سنورتے، بکھرتے، جلتے بجھتے اور سلگتے لفظ......

اور لفظوں کے سحر سے گدگداتے رابطے اور رابطوں میں چھپے زمانے اور زمانوں میں گھومتی زندگی......

وقت نے سرگوشی کی زمانہ مختصر ہی سہی مگر آؤ اسے مل کر حسین بنا لیں، محبتوں سے لبالب بھر لیں۔

کچھ ہی دیر کی بات ہے نہ یہ زمانہ ہوگا، نہ لوگ، نہ فرصتیں، نہ وبائی امراض کا خوف، نہ کورونا، نہ کرونا کے اثرات...... نہ یہ تنہائی، نہ فاصلوں میں پھیلی مواصلاتی قربتیں۔ ہم بھی خواب و خیال ہو کر کہیں ہواؤں میں، خوشبوؤں میں رچ بس جائیں گے......

مگر ہماری مہک رہے گی گمنامی کے ساتھ جہانِ تازہ کی غلام گردشوں میں......

اور ہم...... یقیناً ہم کوئی اور دنیا اور بستیاں بسانے کے لیے پھر سے تازہ دم ہو کر، پھر سے جوان ہو کر کچھ اور کر رہے ہوں گے۔

اس سے پہلے کہ فانی دنیا کے دکھ ہماری زندگیوں کو لہولہان کر دیں۔ ہم کانٹے چُن کر راستوں کو ہموار کیوں نہ کر دیں۔ تاکہ یہاں گلاب کاشت ہوں۔ چنبیلی مہکے...... رس بھرے پھلوں کی خوشبو سے دھرتی سج جائے۔ پہاڑوں، سمندروں، سجے سنورے گھروں، ندی، نالوں اور پہاڑوں سے گرتی آبشاروں کے لُطف کے حُسن کو سمیٹ لیں۔

باہر کا حُسن منظر نگاری میں اور اندر کا حُسن خوشی، لطافت، نفاست اور دکھ سکھ بانٹنے میں ہے۔

جو بس میں نہیں، اس کے لیے کاہے کا دکھ......

آؤ مل کر...... جو بس میں ہے اس کا فطری اور بھلا سا مصرف ڈھونڈ لیں۔

گرمیوں کی چھٹیاں

آج کل یوں لگ رہا ہے گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے بہت سی کتابوں کے ہمراہ ہوسٹل سے گھر آئی ہوں۔

میرے والد محکمہ انہار میں ملازم تھے جنھیں شہروں سے دور بنگلوں میں رہنا پڑتا تھا۔ ان بنگلوں میں محکمہ انہار کے ملازم ہی رہتے تھے جو متعلقہ جگہ کو جنگل میں منگل بنالیا کرتے تھے۔

-میں اور میرا ہم جماعت بھائی امان اللہ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے گھر آتے تو لائبریرین سے دوستی کی بناپر میرے ساتھ ڈھیر ساری کتابیں بھی ہوتیں۔

گھر میں بڑے بڑے درختوں کی چھاؤں میں سرگوشیاں کرتے پتے...... پرندوں کے چہچہاہٹ...... جگالی کرتی بھینسیں...... اُچھلتی کودتی بکریاں...... مرغیاں اور پاؤں میں لوٹ پوٹ ہوتے کتے...... یہی ہمارا ماحول تھا۔

جس میں ہم نے دو مہینے گزارنے ہوتے تھے۔ ان چھٹیوں میں ہونے والی بہت سی شرارتیں یاد آتی ہیں تو بین کرتے اس ماحول میں بھی مسکراہٹ لبوں پر بکھر جاتی ہے۔

ہمارے گھر کے قریب ہی ایک ملازم رہتا تھا معمولی سی ہی تنخواہ تھی مگر ہر سال ان کے ہاں ایک نیا بچہ پیدا ہو جاتا۔

ہمارے گھر ان دنوں خاندانی منصوبہ بندی کا رسالہ ''سکھی گھر'' آتا تھا جس کے ساتھ بچے کم پیدا کرنے کے بارے میں بہت سالٹریچر بھی ہوتا تھا۔ جب ہمسایہ فیملی کے گھر ساتواں بچہ پیدا ہوا تو میرے بھائی کو شرارت سوجھی اور وہ چپکے سے اس کے گھر وہ سارا لٹریچر پھینک آیا۔

ہمسائے کی بیوی کو پتہ چلا تو اس نے گلی میں کھڑے ہو کر وہ گالم گلوچ کیا کہ خدا کی پناہ......

وہ گلی میں کھڑی ہو کر چیختی رہی، ہمارے بچوں سے جلنے والا سامنے آئے میں چیر کر رکھ دوں گی۔ہم ڈر گئے۔ابو کو پتہ چلا تو انھوں نے معاملہ ٹھنڈا کرنے کے لیے فوراً پوچھ گچھ شروع کر دی۔

تھوڑی ہی دیر میں ابو کو معلوم ہو گیا کہ یہ میرے بچوں کی شرارت ہے۔ہمیں خوب ڈانٹ پڑی مگر معاملہ مٹھائی بانٹ کر رفع دفع کر دیا گیا۔

ان چھٹیوں میں میری سہیلیوں سے خوب خط و کتابت ہوتی۔بلاشبہ ہر روز دو چار خط تو ضرور آتے اور جاتے۔

قریبی گاؤں جہاں ڈاکخانہ تھا وہاں کا ہر آدمی میرا نام جان جایا کرتا تھا جو کہ میرے بھائی اور والد کو بہت بُرا لگتا، گویا نام جاننے سے بھی بے پردگی ہوتی تھی۔

یہ وہ وقت تھا جب میں اور میری بہت پیاری دوست فرحت ہاشمی روزنامچے کی طرح ایک دوسرے کو خط لکھتیں اور دنیا جہان کے مسائل اچھی کتابیں، دین کے تقابلی معاملات، تاریخ، تحقیق غرض ہر موضوع زیرِ بحث ہوتا۔

کبھی کبھی تو میرے خطوط سنسر بھی ہوتے۔

طبیعت رواں تھی۔کاغذ اور پین ہاتھ میں پکڑتے ہی صفحوں کے صفحے لکھ کر پوسٹ کر دیا کرتے تھے۔اپنی عمر سے زیادہ سنجیدہ اور تجربے سے زیادہ ثقیل ساری کتابیں اسی عمر میں پڑھیں۔

اور اب کئی دنوں سے اپنی حد سے زیادہ حساس طبیعت کے پیشِ نظر گردوپیش کے حالات اور فراغت میں ٹی وی دیکھ دیکھ کر اپنے ناکردہ گناہوں کے احساسِ جرم کے زیرِ عتاب رہی۔

تو سوچا کیوں نہ کتاب سے جڑا جائے۔

ٹی وی بند کیا اخباروں پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی فون کو ایک طرف رکھا اور ''دو مینار کی بلندی'' سے مسعود مفتی کے ساتھ زندگی کو پستیوں اور بلندیوں کے وسیع تناظر سے جھانکنا شروع کیا۔یوں محسوس ہوا میں پھر سے چھٹیاں گزارنے گھر آئی ہوں۔

ردی ہی تھی جلادی

تقریباً ڈیڑھ مہینے کے بعد زندگی کچھ کچھ طور طریقے بدلنے لگی تھی......لوگ خوف کی دیوار پھلانگ کر سڑک پر نظر آنے شروع ہو گئے تھے۔ سامنے والے گھر کے لڑکے اپنے دوستوں کے ساتھ افطاری کے بعد بیڈ منٹن کھیلتے تو ایک سماں سا بندھ جاتا۔ بازی جیتنے پر خوشی سے قہقہے لگاتے ان لڑکوں کی آوازیں جب پختہ سیمنٹ کی دیواروں میں چھید کرتی میرے گھر میں داخل ہوتیں تو لگتا زندگی جی اٹھی ہے۔

مائیں بھی بچوں کی اُنگلیاں پکڑے سیر کرتی ہوئیں بہت اچھی لگتیں۔ ان کو دیکھ کر دل میں زندہ رہنے کی اُمید سی جاگ اُٹھتی۔ یکم مئی کی سرمئی شام افطاری کے بعد تھوڑی بوندا باندی اور ٹھنڈی ہواؤں سے موسم میں خنکی سی آ گئی تو ہم نے بھی سوچا کیوں نہ واک کی جائے۔ سڑک پر نکلتے ہی رات کی رانی گلاب اور چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو نے کورونا کے سارے خوف کو دور کر دیا۔

خدا کیسے پھولوں میں عطر بھرتا ہے کہ گرد و پیش کا پورا ماحول ہی مہک اُٹھتا ہے۔

اسلام آباد کی سہانی شام خوشبو سے معطر ہوا اور سڑکوں پر واک کرتی زندگی...... میں نے سوچا صحت بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ اگر صحت نہ ہوتی تو میں اس سارے منظر سے کیسے لطف اندوز ہوتی۔

آج صبح کا منظر بھی حسین تھا۔ لاک ڈاؤن کی وجہ سے زندگی میں پہلی دفعہ صبح صادق، دوپہر، سہ پہر، شام اور طلوع و غروب کے مناظر سے جی بھر کر لطف اندوز ہونے کا موقع ملا تھا۔

سورج جس شان سے طلوع ہوتا ہے اسی شان سے غروب ہو جاتا ہے۔

اسی طرح انسانی زندگی بھی تو وقت کی غلام گردش ہی کا دوسرا نام ہے۔ انسان کی زندگی کا

سورج بھی تو ایک نہ ایک دن غروب ہونا ہی ہوتا ہے پھر کا ہے کا غم......ہیشگی کی زندگی تو کسی نے بھی نہیں پائی......

گلی کوچے میں اُڑتے پرندے اور انسان دیکھ کر میں سوچتی رہی آزادی بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔

میں نے انٹرنیٹ پر دنیا کے کونے کونے سے دوستی کے رشتے میں بندھے لوگوں کو یاد کیا تو مجھے لگا مجھے جاننے اور پہچاننے والے اس سے پہلے اتنے زیادہ کبھی نہ تھے۔

ایک ایک شناسا چہرہ آنکھوں کی پتلیوں میں آ کر بسیرا کرنے لگا......

جن کے دم سے زندگی میں رنگ بھرنے لگتا ہے۔ وہ لوگ آپ کے آس پاس ہی ہوتے ہیں، انھیں دیکھنے اور پرکھنے کے لیے اپنے من کی میل کو بھی تو دھونا پڑتا ہے۔

اپنی ذات کی نفی ہی سے محبتوں کا نزول ہوتا ہے۔ کائنات میں آنے والا ہر انسان چراغ ہے روشنی کا منبع ہے۔

دماغ سے سوچوں اور خواب وخیال کی روشنی......

آنکھ سے منظر کو دیکھنے سمجھنے اور پرکھنے کی روشنی۔

قوت سماعت سے ان گنت آوازوں کو مقناطیسی قوت سے کھینچنے کی روشنی۔

چھونے سے محسوس کرنے کی روشنی۔

زبان سے کام ودہن کی لذتیں......

انسان کے ساتھ ہی کائنات کی رونقیں وابستہ ہیں یا پھر انسان ہی کے لیے سب رونقیں ہیں۔

یادوں کے دریچے سے سوچوں کا البیلا پن اُمڈ اُمڈ کر برسنے لگا۔

وابستگی کے خیال سے ایک یاد کانٹے کی طرح چبھنے لگی۔

شادی کے بعد میں ایک دن امی کی طرف آئی تو گلبرگ والے گھر میں گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی راکھ کے ڈھیر نے میرا استقبال کیا۔ راکھ گرم تھی اور کہیں کہیں چنگاریاں بھی اچک اچک کر مجھے متوجہ کر رہی تھیں۔

راکھ کے اس ڈھیر کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی سبز رنگ کی صندوقچی پڑی ہوئی تھی جس پر ٹرک آرٹ کے مٹے مٹے سے نقوش واضح تو نہیں تھے مگر ابھی بھی اس کی خوبصورتی برقرار تھی۔

صندوقچی کا منہ کھلا تھا مجھے لگا وہ بانہیں کھول کر مجھے اپنے چھوٹے سے وجود میں سمو لینا چاہتی ہے۔ میرا بھائی امان اللہ اور میری والدہ راکھ کے اس ڈھیر کو ہوا دے رہے تھے۔

میں تو کلیجہ تھام کے وہیں بیٹھ گئی...... میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے انھیں دیکھ کر صرف اتنا کہا:

یہ آپ لوگوں نے کیا کیا؟

میری گزشتہ زندگی کا ہر نقش جل کر خاک ہو چکا تھا...... میری سہیلیوں کے خطوط خاص طور پر فرحت ہاشمی کے فلسفے سے بھرے خطوط...... اسے ہمیشہ میری سالگرہ یاد ہوتی تھی اور وہ گوند سے مبارکباد لکھ کر اس پر ستارے چپکا کر مجھے بھیجا کرتی تھی۔

اس زمانے میں قلم کی روانی کا یہ عالم تھا کہ جونہی بیٹھتی لکھتی ہی چلی جاتی۔ بے شمار افسانے کہانیاں...... نوٹس...... مجھے بچپن ہی سے ڈائری لکھنے کا شوق تھا۔ میری اہم ڈائریاں بھی اسی صندوقچی میں تھیں......

میرے بھائی نے ترنت جواب دیا

''اب تم نے انھیں کیا کرنا تھا؟

ردی ہی تھی جلا دی''

امی کا جواب تھا:

ہمیں کیا پتہ کس کس کے خط سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ اب تمھاری شادی ہو چکی ہے۔ ہم نے سوچا تمھارا میاں ان خطوط کے پلندے کو دیکھ کر نہ جانے کیا سمجھے...... بہت سی لڑکیوں کے اسی وجہ سے گھر خراب ہو جاتے ہیں۔

میرے گھر والوں نے اپنی دانست میں میرے گھر کو تباہ ہونے سے بچا لیا تھا اور میرے ٹوٹنے کی صدا تک بھی ان تک نہ پہنچ سکی تھی۔ تباہی سے محفوظ گھر میں ننگے پاؤں لہولہان ہوتے تلوؤں کی چبھن...... بدن کی تجوری میں اضافہ تو کرتی رہی، ازالہ کبھی نہ کیا۔

کچھ واقعات اپنی تمام تر شدت اور جدت کے ساتھ زندگی کا حصہ بن کر سائے کی طرح ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ آج ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے جس کی کسک وقت کے ساتھ بڑھتی رہی......

شادی کے چند دن ہی ہوئے تھے مجھے میرے بیڈروم سے بلا کر کہا گیا:

تصویر بنانی ہے۔

میں نے اپنا حلیہ درست کیا ڈرائنگ روم میں گئی تو وہاں ساتوں بہن بھائی اپنی اپنی پوزیشن سنبھال کر کھڑے تھے۔ میں بھی اس قطار کی طرف بڑھی تو مجھے فوراً یہ کہہ کر روک دیا گیا۔

یہ ہماری فیملی کی تصویر ہے آپ کو تو تصویر کھینچنے کے لیے بلایا گیا ہے۔

شادی کے چند دنوں بعد ہی یہ ان بے شمار جھٹکوں میں سے ایک جھٹکا تھا جسے میں زندگی بھر نہیں بھلا سکی اور نہ ہی سمجھ سکی کہ مجھے اس کا دُکھ کیوں ہوا تھا؟

چند دِن کی بہو کو گھر میں بلا کر یہ احساس دلانا کہ تم فیملی کا حصہ نہیں ہو......ان کے لیے کوئی انہونی بات نہیں تھی۔

کچھ تلخ یادیں

یادوں کے دریچوں سے جھانکتی کچھ ایسی یادیں جنھیں قدرت نے مرہم رکھ کر مندمل بھی کر دیا مگر اس کی کسک جاتی ہی نہیں۔ لاکھ پردوں میں چھپاؤ لاکھ بھلانے کی کوشش کرو مگر اس کی جھنکار چھن چھن کرتی نظروں کے سامنے آ کر دھمال ڈالنے لگتی ہیں اور میں سوچنے لگتی ہوں زندگی تو یہ ہے۔

زندگی کے جھٹپٹے میں وہ وقت بھی آیا جب ہم تین بہن بھائی چھوٹے تھے اور والد بیمار ہو گئے۔ بیماری بڑھتی گئی حتیٰ کہ سرکاری گھر چھٹ گیا۔ طویل چھٹی بغیر تنخواہ کے لینی پڑی اور والد صاحب کو ہسپتال داخل ہونا پڑا۔ جمع پونجی خرچ ہو چکی تھی۔ اب ہمارا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ والدہ کو تین بچوں کے ساتھ کوئی بھی پناہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ والد کو تو ان کے بھائیوں نے سنبھال لیا اور والدہ کو بچوں سمیت گاؤں میں ایک ویران سے گھر میں بھیج دیا گیا۔

ایک باپردہ خوددار عورت تین بچوں کے ساتھ نہ پیسہ نہ وسائل نہ جیون ساتھی ...... اگر ساتھ کچھ تھا تو رشتوں کی کڑواہٹ اور لوگوں کے رنگ برنگے کھٹے میٹھے رویے۔ اچھے وقتوں میں دیا ہوا اُدھار بھی لوگوں نے سنبھال لیا۔ تقاضا کرتے تو طرح طرح کے جوابات ملتے جو کلیجہ چھلنی کر دیتے۔

میری والدہ بہت اچھے خاندان کی تھیں۔ میرے نانا پاکستان بننے سے پہلے وفات پا گئے تھے۔ وہ انڈیا میں ایک اچھے سرکاری عہدے پر تھے اور خاصے خوشحال تھے۔

مولانا غلام رسول مہر ''زمیندار اخبار کے مدیر'' رشتے میں میری والدہ کے چچا لگتے تھے۔ بہت پڑھا لکھا زمیندار گھرانہ تھا۔

نئی مملکت میں ابھی پرانے قانون تھے جس کے مطابق بیٹیوں کو زرعی زمین سے حصہ نہیں دیا

جاتا تھا۔ یوں تو میرے ماموں خاصی جائیداد کے مالک تھے اور انھیں اس جائیداد پر قانونی حق بھی حاصل تھا۔ پرانے قوانین کی رو سے انھیں ضمیر کی ملامت کا بھی سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔

مگر میری والدہ کو ان حالات میں دلاسہ دینے والا کوئی نہیں تھا۔

سگھڑاپہ، سلیقہ، خودداری اور سمجھداری میری والدہ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ سو یہ وقت تھا ان سب صلاحیتوں کو اور اپنی شخصیت کی مضبوطی کو آزمانے کا۔

قدرت کس کس طرح انسانوں کو آزمائش میں ڈالتی ہے۔ وقت اور حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔

امی کی ایک ہی بہن تھی ان کے حالات بھی کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے مگر وہ ساتھ والے گاؤں میں ہی رہتی تھیں۔ میرے خالو امی کے کزن بھی تھے۔ وہ ہر جمعے کو ہمارے گھر آتے اور کچھ نہ کچھ امی کو دے جاتے۔ ایک دفعہ انھوں نے مجھے کچھ پیسے دیے اور واپسی کے لیے اپنی سائیکل موڑ لی۔ میں بھاگتی ہوئی ان کے پیچھے گئی اور کہا میرے بھائیوں کو بھی دے کر جائیں۔ وہ مسکراتے ہوئے فوراً واپس آئے اور کہا لو بھئی تمھارے بھائیوں کو بھی دے جاتا ہوں۔ یہ بات کافی عرصہ میرا مذاق بنی رہی۔

ایک دفعہ وہ کچھ مرغیاں دے گئے۔ ان میں اللہ نے ایسی برکت ڈالی کہ ان سے نہ صرف یہ کہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوا بلکہ ان کے انڈوں سے ہماری دال روٹی چلنے لگی۔ سستا زمانہ تھا خواہشات محدود تھیں گندم وغیرہ تو زمین سے آجاتی تھی مگر باقی اخراجات امی اپنی سمجھداری اور سلیقہ مندی سے ہی کرتی تھیں۔ کیسے کرتی تھیں آج بھی سوچتی ہوں تو دل مٹھی میں آجاتا ہے۔

نہ اُدھار واپس ملا، نہ کسی رشتے دار نے پوچھا، نہ کبھی نیا کپڑا پہنا اور نہ کبھی کسی کھلونے سے کھیلنے کا لطف لیا۔ کبھی اتنے پیسے جمع ہی نہیں ہوئے تھے کہ ہم ان دو سالوں میں کبھی والد سے ملنے اسپتال جاسکتے۔ والد بچوں کے لیے تڑپتے تھے اور ہم والد کے لیے......

دو سال جس کسمپرسی میں گزرے آج بھی اس کی کڑواہٹ نے مجھے زمینی سچائیوں کے ساتھ مضبوطی سے جوڑا ہوا ہے۔ آج بھی میں ان بچوں کے درد اور تکلیف کو جن کے سر پر باپ کا سایہ نہیں ہوتا اسی شدت سے محسوس کرسکتی ہوں۔ اِسی لیے میں ہمیشہ انسان کو اس کے ظرف سے پہچانتی ہوں دولت سے نہیں......

تکبر سے شناسائی تک نہیں۔ زندگی کو اس کی پوری گہرائی اور گیرائی سے جاننے اور پہچاننے کا سلیقہ آ گیا تو انسانیت کا دکھ درد مجبوریاں اور پریشانیاں سمجھنے میں آسانی ہوگئی۔ دیہات کی سادگی اور محنت کش زندگی کی جھلک کے گہرے نقوش دماغ کے کسی گوشے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے۔ وقت نے خمیر میں دردمندی کا جذبہ گوندھ کر آنے والی زندگی کی سختیوں کے لیے تیار کر دیا۔

میں گھر میں بڑی تھی، ابھی بچپن کا جھٹ پٹا ہی تھا مگر مجھے یاد ہے اس زمانے میں پینسٹھ کی جنگ ہو رہی تھی۔ وطن پرستی کا جذبہ بھلائے نہیں بھولتا۔ گھر گھر پاک فوج کے لیے دُعاؤں اور محبتوں کے پھول نچھاور کیے جاتے تھے۔ خواتین گھروں میں بیٹھ کر دشمن کو نیست و نابود کر دینے کی دُعائیں یا بددُعائیں مانگا کرتی تھیں۔

فوجی بھائی کسی لڑکی کے جسم میں دھڑکتے ہوئے دل کی طرح تھا اور بزرگوں کے لیے سراپا محبت اور عقیدت کا منبع۔

تحریکِ پاکستان کا جذبہ دلوں میں جاگزیں تھا اور لوگ ریڈیو کے ذریعے ہر وقت حالات سے باخبر رہتے تھے۔ سیربین پروگرام لوگ بہت ذوق و شوق سے سنتے تھے۔

گاؤں میں ہمارے گھر کے قریب ہی ایک گھر تھا جس کا ایک کمرہ بند پڑا رہتا تھا۔ یہ بھگت سنگھ کی جنم بھومی تھی...... دو سال بعد والد صاحب تندرست ہو کر گھر آ گئے نوکری پر بھی بحال ہو گئے اور ہماری محرومیوں کا ایک ایک نشان مٹتا چلا گیا۔

محکمہ انہار

محکمہ انہار کے بنگلوں سے جھلملاتی یادیں گھر سے باہر کشادہ زمین لان پھل دار درخت اور درختوں میں پڑے جھولے سب کچھ ہوتا تھا مگر گھروں کی چار دیواری نہیں ہوتی تھی۔

ہمارے گھر سے ملحقہ ایک بہت بڑا آم کا درخت تھا جس کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئیں تھیں۔اس درخت کے نیچے بیٹھ کر ہم اپنا چھٹیوں کا کام کیا کرتے تھے۔آم کے اس درخت کو بور لگتا تو چاروں طرف اس کی خوشبو پھیل جاتی پھر ہم اس درخت کے تلے انہی خوشبوؤں سے اس بور کو آموں کی شکل اختیار کرتا ہوا دیکھتے رہتے۔

وہ آم کا درخت آج بھی یاد آتا ہے تو یوں لگتا ہے۔اسے اللہ نے خاص طور پر عرشِ بریں سے زمین پر اُتارا ہے۔اس کا آم اتنا رسیلہ ہوتا تھا کہ آج چالیس سال بعد بھی ذائقہ نہیں بھولا۔اس درخت کو اتنا پھل لگتا کہ پتے چھپ جاتے اور آم نمایاں نظر آتے۔بنگلے کا پورا عملہ پیٹ بھر کر کھاتا مگر آم ختم نہ ہوتا۔

ہم بہن بھائی اس درخت کے نیچے بیٹھے ٹپکے کے آم اکٹھے کیا کرتے تھے، جونہی کوئی آم گرا برق رفتاری سے ہم تینوں بھاگتے جس کے ہاتھ آجاتا اس کی خوشی دیدنی ہوتی تھی۔

ہمارے گھر میں کھانا اکٹھے بیٹھ کر کھایا جاتا تھا۔لہٰذا امی کا حکم ہوتا کہ آموں کو بالٹی میں اکٹھے کرتے رہا کرو شام کو مل بیٹھ کر کھائیں گے۔آموں کے بعد کچی لسی تو آموں کی طرح ہی ضروری تھی۔آم اُترتے تو عملے کے لوگوں میں برابر تقسیم ہو جاتے۔چوری کر کے کھانے کا کوئی رواج نہیں تھا۔

ایک دفعہ ہم بہن بھائیوں کو شرارت سوجھی گھر کے ساتھ ملحقہ بیلدار کے گھر کی کھڑکی کے

باہر جو کھیتوں میں کھلتی تھی وہاں سارے چھلکے پھینک آتے۔ چھلکوں کا ڈھیر دیکھ کر کسی نے ابو سے شکایت لگا دی کہ یہ بیلدار آم چوری کر کے کھاتا ہے اور چھلکے کھڑکی سے باہر پھینک دیتا ہے۔ ابو نے دیکھا تو ثبوت بھی مل گیا۔ اس بیچارے کو بلایا گیا وہ قسمیں کھاتا رہا مگر ثبوت کو تو نہیں جھٹلا سکتا تھا، اس کی خوب شامت آئی۔

درختوں پر بجرے کا گھر بناتے دیکھنا بہت ہی دلچسپ مشغلہ تھا۔ نر اور مادہ ایک ایک تنکا جمع کر کے جس نفاست اور ذہانت سے گھر بنایا کرتے تھے وہ دیکھنے کے لائق ہوتا۔ ہمارا روزانہ اسے دیکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہ تھا۔ گھر بن جاتا تو پھر انڈوں کا مرحلہ آتا۔ پھر ایک دن ان میں سے بچوں کی آوازیں آنے لگتیں۔ وہ مرحلہ بھی آتا کہ بچے اُڑ جاتے، پھر نر اور مادہ بھی کہیں چلے جاتے اور خالی گھونسلہ تیز ہوا کی زد میں آ کر زمین پر آ گرتا۔

ہم بھاگ کر اسے اٹھا کر لے آتے۔ زندگی کے تمام مرحلوں سے گزرنے کے باوجود وہ صاف شفاف ہوا کرتا تھا، کسی قسم کی بدبو اس کے اندر نہیں ہوتی تھی۔

ہم اسے کھول کر دیکھتے اس کے اندر الگ الگ حصے بنے دیکھ کر حیران رہ جایا کرتے تھے۔ پھر اندازے لگایا کرتے تھے کہ یہ بچوں کا بیڈ روم ہو گا یہ والدین کا کمرہ ہو گا۔

ہمارے گھر کے ایک طرف کینوؤں اور سنگتروں کا باغ بھی تھا۔ میرا جب دل چاہتا میں کسی بھی درخت پر چڑھ کر درجنوں سنگترے کھا لیا کرتی تھی۔ گلہریوں کی طرح درختوں پر چڑھنا بھی میرا محبوب مشغلہ تھا۔

کبھی کبھی نہر میں نہانے کی اجازت بھی مل جاتی تھی مگر بڑی احتیاط سے سب کو بتا دیا جاتا تھا کہ نہر کی طرف کوئی نہ جائے۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیرنا اور بہاؤ کے خلاف تیرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ پانی کی طاقت کا اندازہ بھی پانی میں اُتر کر ہی ہوا۔

نہر کی پٹڑی پر سائیکل چلانے کا بھی جنون کی حد تک شوق تھا۔ پٹڑی پر سائیکل چلانے کی اجازت نہیں ملا کرتی تھی مگر ابو کون سا ہر وقت گھر پہ ہوتے تھے۔

آج کی طرح اس زمانے میں بھی میرے جیسے بولڈ تجربے کرنے کے لیے میری کوئی ساتھی نہیں ہوتی تھی۔ اکیلی ہی سائیکل چلانے چلی جاتی اور بسا اوقات بہت دور تک نکل جایا کرتی تھی۔

نہر کی اسی پٹڑی پر ایک دفعہ دور سے گاڑیوں کا ایک قافلہ آتا دیکھا تو میں سائیڈ پر رک گئی کچھ ہی دیر بعد ایک گاڑی میں بھٹو صاحب کو دیکھا جو مسکراتے ہوئے پاس سے گزر گئے۔ اس دن میں بے فکری سے سائیکل چلاتی ہوئی بہت دور نکل گئی تھی اچانک ویسپا سکوٹر کی آواز سنی تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔

اس علاقے میں صرف میرے ابو کے پاس ہی ویسپا سکوٹر ہوتا تھا۔ میں ڈر گئی بس پھر کیا تھا آؤ دیکھا نہ تاؤ سائیکل بھگا دی۔ سائیکل اور موٹر سائیکل کے کم ہوتے فاصلے کو بھی دیکھتی جاتی اور سائیکل بھی چلاتی جاتی۔ بالآخر میں گھر کے قریب پہنچ گئی، ہمارا بنگلہ نہر کی پٹڑی سے کافی ڈھلوان پر تھا۔ میں نے اُترتے ہوئے سائیکل کو آزاد چھوڑ دیا اور بریک سے بھی ہاتھ اُٹھا لیا بس پھر کیا تھا تیز رفتار سائیکل درخت سے جا ٹکرائی۔ اس کا اگلا حصہ ٹوٹ گیا، مجھے بھی خوب چوٹیں آئیں مگر اس میں خیر کا پہلو یہ نکلا کہ میں ابو کی مار پیٹ سے بچ گئی وگرنہ اس دن تو یہ ''لاڈ پیار'' ضروری ہو گیا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ میرے سائیکل چلانے پر مکمل پابندی لگ گئی۔ تقریباً چالیس سال بعد اس علاقے میں گئی تو ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اسے بتایا کہ اس بنگلے میں میرا بچپن گزرا ہے۔ کہنے لگا اور تو کچھ یاد نہیں دو پونیوں والی ایک بچی یاد ہے جو سائیکل بہت چلایا کرتی تھی۔

میرے گھر کے قریب کوئی لڑکیوں کا اسکول نہیں تھا۔ بڑے صلاح مشورے کے بعد مجھے لڑکوں کے اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ پورے اسکول میں، میں واحد لڑکی تھی جو ہیڈ ماسٹر اور تمام اسکول ماسٹرز کی چہیتی تھی ہر بچہ اور بڑا میری عزت کرتا تھا۔ مجھے اسکول میں خصوصی مراعات حاصل تھیں۔ صرف ہیڈ ماسٹر صاحب کی موجودگی میں مجھے اسکول جانے کی اجازت تھی اگر دوران اسکول ہیڈ ماسٹر صاحب کو کہیں جانا پڑ جاتا تو وہ پہلے مجھے سائیکل پر بٹھا کر گھر چھوڑتے پھر اپنے کام سے جاتے۔

میرے گھر کے ساتھ ہی مالی کا گھر بھی تھا، مالی کی بیٹی میری ہم عمر تھی۔ میری اس کے ساتھ دوستی ہو گئی۔ مالی کی بیوی اور بیٹی چھابے، مٹی کے چولہے اور کروشیئے کی چیزیں بنا کر بیچا کرتی تھیں۔ میری امی کو یہ دوستی بہت کھٹکتی تھی مگر میں گرمیوں کی دوپہر کو امی کے سونے کا انتظار کرتی رہتی اور پھر چپکے سے ان کے گھر جا کر ان سے کروشیہ اور چھابے بنانا سیکھا کرتی۔ یہ ہنر زندگی بھر میرے ساتھ ساتھ رہا اور اب بڑھاپے میں بوریت کو دور کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

درختوں پر پڑے جھولے تو میرے قدموں کی طاقت آزمائی سے یوں ہوا میں لہرانے لگتے کہ پاس کھڑے لوگ اللہ اللہ کرتے رہ جاتے۔

جھولے کو پاؤں کی خاص حرکات وسکنات سے میں اتنا اونچا لے جایا کرتی تھی کہ وہ کھلی فضا میں برابری کی سطح پر پہنچ جایا کرتا تھا۔ایک دفعہ جھولا اپنے پورے جوبن پر تھا......اور جھولے کی رسی ٹوٹ گئی۔

میں پاس ہی ایک سوکھے ریت سے بھرے کھالے میں جا گری ہڈیاں تو ٹوٹنے سے بچ گئیں مگر اندرونی اور بیرونی چوٹیں خوب آئیں......کئی ہفتے امی جھڑکیوں اور گالیوں کی بوچھاڑ میں ہلدی پلا پلا کر اور ریت کی پوٹلی سے سیکائی کر کے ٹھیک کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔

ایک دلچسپ واقعہ یاد آ رہا ہے، میرے بھائی امان اللہ کے شوق کچھ اور قسم کے تھے۔ایک دفعہ رات کا وقت تھا اس زمانے میں صحن میں پانی کے چھڑکاؤ کے بعد لان میں چارپائیاں بچھا کر ایک طرف پنکھا لگا کر سونے کا سامان کیا جاتا تھا۔ابھی ہم لوگ سوئے نہیں تھے کہ سٹور سے چوں چوں کی آواز آنے لگی سٹور میں بجلی بھی نہیں تھی سب ڈر گئے کہ یہ کیسی انہونی سی آواز ہے اور سٹور سے کیوں آ رہی ہے۔ابھی امی ابو کھوج لگانے کی کوشش میں ہی مصروف تھے کہ میرے بھائی نے بستر سے چھلانگ لگائی لیمپ روشن کیا اور سٹور کی طرف بھاگنے لگا۔لیمپ کی روشنی میں دیکھا تو معلوم ہوا۔اس نے گھر والوں سے چھپ کر تجربے کے طور پر مرغی کے انڈوں کو خاص گرماہٹ میں رکھا ہوا تھا یہ دیکھنے کے لیے کہ اس میں سے بچے نکلتے ہیں یا نہیں اور آج اس کا یہ غیر معمولی تجربہ کامیاب ہو چکا تھا اور اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

کالج میں داخلے کے لیے

عصرِ حاضر میں میرے سامنے والے گھر میں بھی بچیاں رہتی ہیں......وہ اپنے گھروں میں بیٹھ کر فرصت کے دن کیسے گزارتی ہیں، مجھے معلوم نہیں مگر آج مجھے وہ دن یاد آرہے ہیں جب میٹرک کا امتحان پاس کیا تو امی نے دو بیڈکور لا دیئے اور کہا کہ ان پر کڑھائی کرو۔کل کو یہ بیڈکور تمھارے جہیز کے کام بھی آئیں گے۔ان کا خیال تھا کہ فارغ دماغ شیطان کی آماجگاہ ہوتا ہے۔

مجھے یاد ہے میں نے ہلکے پیلے رنگ کی چادر کا بیڈکور موتی ٹانکے سے بنایا تھا اور سفید چار سوتی کے بیڈکور پر رنگ برنگے دھاگوں سے بہت ہی خوبصورت کڑھائی کی تھی اور نیلے رنگ کی ساڑھی جس پر ستاروں کا کام میں نے بڑی ہی محنت سے کیا تھا اسے آج تک میں نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔

میں کام میں ہمیشہ سے ہی بہت پھرتیلی تھی۔ وہ کام جو خواتین گھنٹوں میں کرتی تھیں میں منٹوں میں کرلیا کرتی تھی۔ جتنی کام میں تیز تھی اتنی ہی مزاج کی بھی تیز تھی۔

میری امی اکثر ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا کرتی تھیں میری سمجھ میں نہیں آتا میں اس کی شادی کہاں کروں؟ اِسے صبح سسرال بھیجا تو شام کو واپس بھی آجائے گی، کسی کی لاج نہیں رکھے گی۔

امی کا خیال تھا کہ میں بے حد غصیلی، ضدی اور نک چڑھی ہوں۔لہٰذا اس کا واحد حل یہ ہے کہ میری شادی کردی جائے تاکہ میں دوسرے گھر میں ایڈجسٹ ہوسکوں۔امی نے میرے والد کو بھی اپنے خدشات سے آگاہ کر کے قائل کرلیا تھا۔

گھر میں میرے بھائی کے کالج میں داخلے کی باتیں ہوتی رہتی تھی مگر میرے بارے میں بالکل بھی سوچا نہیں جارہا تھا۔جب میں احتجاج کرتی تو امی صاف صاف کہہ دیتیں کہ تمھارا بھائی تو

لڑکا ہے، کل کو اس نے کمانا ہے اور گھر چلانا ہے۔ تم نے تو چولہا ہی جلانا ہے جس کے لیے اتنی پڑھائی کافی ہے۔

میں بہت دُکھی ہو جاتی مجھے یاد ہے میں نے ان دنوں کیکر کی پھلیوں کو توڑ کر ان سے ایک لمبی تسبیح بنائی اور سارا دن تسبیح کر کے دُعا مانگتی رہتی یا اللہ مجھے بھی اپنے بھائی کی طرح کالج میں جانے کا موقع مل جائے۔

میرے ایک تایا کا سارے خاندان پر بہت رُعب تھا۔ کوئی بھی ان کے سامنے نہیں بولتا تھا۔ دو شادیوں کے ناکام تجربے سے گزر چکے تھے پہلی شادی سے دو بچیوں کو تو ہم نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ میرا جب میٹرک کا رزلٹ آ گیا اور فرسٹ ڈویژن سے پاس ہوگئی تو میں نے اپنے انہی تایا سے اپنے والد کی شکایت لگائی کہ وہ مجھے فرسٹ ایئر میں داخلہ نہیں دلوا رہے۔ انھوں نے کہا ایسی تیسی تمھارے والد کی...... امی کو بلایا اور حکم صادر کر دیا کہ نعیم بھی آگے پڑھے گی۔

مجھے عام لڑکیوں کے برعکس اس بات کا شدید احساس تھا کہ شادی خوابوں، ارمانوں اور تجربوں پر فل سٹاپ لگانے کا نام ہے۔

سو میں نہیں چاہتی تھی کہ میری شادی ہو جائے اور میں ایک دائرے میں مقید ہو جاؤں۔ میں ذہین تھی اور اللہ نے سوچنے سمجھنے والا ذہن بھی عطا کیا تھا چھوٹی عمر سے ہی مطالعے کے شوق نے مجھے زندگی کے انوکھے پن سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔

میرے والد کو بھی مطالعے کا بہت شوق تھا۔ اردو ڈائجسٹ بہت پڑھتے تھے۔ ہم پڑھنے لکھنے کے قابل ہوئے تو بچوں کے بے شمار رسالے لایا کرتے تھے۔

میری والدہ پڑھی لکھی نہیں تھیں لہٰذا میرے والد کو جب بھی فرصت ملتی وہ اکثر امی کو کہانیاں پڑھ پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ بسا اوقات ساری فیملی کو اپنے اردگرد بٹھا کر بچوں کی کہانیاں پڑھ کر مزے لے لے کر سناتے......اور توقع کرتے کہ ہم اس پر خوب ہنسیں۔ ہر جملے پر ٹھہر ٹھہر کر ہماری توجہ چاہتے۔

میں تو وہ سب پڑھ چکی ہوتی تھی......تو مجھ سے رہا نہ جاتا اور میں فوراً بول دیا کرتی کہ آگے

کیا ہوگا جس سے ماحول بھی بدمزہ ہو جاتا اور ابو کو غصہ بھی آ جاتا۔

اس کا علاج ابو نے یہ ڈھونڈا کہ مجھ پر پابندی لگ گئی کہ جونہی رسالہ آئے گا امی کے قبضے میں چلا جایا کرے گا اور مجھے روزانہ ایک کہانی پڑھنے کو ملا کرے گی۔

میں تب تیرہ چودہ سال کی تھی جب ابو کا اردو ڈائجسٹ بھی پورا پڑھ لیا کرتی تھی۔

ایک واقعہ سنانے کے بعد پھر کالج کی طرف لوٹتے ہیں۔ میرا کتابوں سے جنون اس حد تک تھا کہ ایک دفعہ ابو ایک کتاب گھر میں لے کر آئے۔ جب ہم بچے سو جاتے تو ابو چپکے چپکے یہ کتاب امی کو پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے ابو کو امی سے کہتے سنا کہ یہ کتاب تالے کے اندر رکھا کرو۔ نعیم کو اس کی بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے۔ ابو نے امی سے رازداری میں بات کی تھی مگر میں نے سن لی۔

کتاب کو روز تالا لگایا جاتا اور ہمارے سونے کا انتظار کیا جاتا۔

کتاب کے حصول کی جستجو کو پَر لگ گئے اور میں نے جوئے شیر کے لیے کدال سے پہاڑ کھودنا شروع کر دیا۔ بالآخر میں کھوج لگانے میں کامیاب ہوگئی کہ امی چابی کہاں رکھتی ہیں۔ بس پھر کیا تھا ابھی ابو امی کا ذوقِ مطالعہ ایک حصہ بھی مکمل نہیں کر پایا تھا کہ میں کتاب ختم کر چکی تھی۔ مجھے یاد ہے وہ اندرا گاندھی کی سوانح حیات تھی۔

میرے ابو کی ان دنوں سرگودھا ٹرانسفر ہوگئی اور یوں مجھے بالآخر سرگودھا ویمن ڈگری کالج میں فرسٹ ایئر میں داخل کروا دیا گیا۔ بہت بڑا کالج بہت بڑی دنیا۔ ایک دم زندگی ہی بدل گئی۔ اسکول کی دنیا تو کہیں بہت پیچھے رہ گئی۔ ہر دن نیا دن نئے تجربات اسرار و رموز کی دنیا۔ یہاں میری دو لڑکیوں سے دوستی ہوگئی جو بعد میں بہت گہری دوستی میں بدل گئی۔

ایک فرحت نسیم ہاشمی ''الہدیٰ'' دوسری مسرت۔ فرحت نے بورڈ میں ٹاپ کیا تھا اور مسرت دوسرے نمبر پر آئی تھی۔ دونوں بہت قابل منظم اور جستجوئے علم کے لیے پاگل سی لڑکیاں تھیں۔ ان دونوں کی بھی میرے سوا کسی سے دوستی نہیں تھی۔

ہم تینوں مل بیٹھتیں تو صرف نئے نئے علوم ہی کی باتیں کرتیں۔ فرحت تو فری پیریڈ میں بھی کسی نہ کسی کلاس میں گھس جاتی اور پھر نئے مضمون کو سمجھ کر ہمیں بھی سمجھاتی۔

میں بھی فرحت کے ساتھ اِس تجربے سے بارہا گزری۔ اساتذہ کو فرحت کے بارے میں معلوم تھا کہ اس نے بورڈ میں ٹاپ کیا تھا لہٰذا اسے کوئی استاد بھی اپنی کلاس میں آنے سے نہیں روکتی تھی خواہ وہ اس نے مضمون لیا ہو یا نہ لیا ہو۔

نئی نئی کتابیں پڑھنا ان پر تبادلہ خیال کرنا نوٹس بنانا بس یہی شوق ہوتے تھے۔

ہماری کلاس میں فیروز خان نون کی بیٹی بھی پڑھتی تھی۔ اس کی ماں انگریز تھی ہماری یہ کلاس فیلو انتہائی حسین لڑکی تھی لگتا تھا کہ اللہ نے اسے فرصت سے بنایا ہے۔ اس کے ساتھ دو لڑکیاں ہوا کرتی تھیں جو ہر وقت اس کی کاپیاں اور کتابیں اُٹھائے اس کے پیچھے پیچھے رہتی تھیں۔ جب یہ کلاس میں ہوتی وہ باہر کھڑی رہتیں اور جب کلاس ختم ہوتی فوراً بھاگ کے اس کے ہاتھ سے کاپی پین لے لیا کرتی تھیں۔ وہ نازک اندام حسینہ جس کی خوبصورت انگلیاں، گلابی جلد، مکھن جیسے نرم ہاتھ قلم کا بوجھ بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔ کافی عرصہ میں اس کے حلقۂ حُسن کی اسیر رہی۔ وہ اپنی شان و شوکت کے قصے سنایا کرتی تو دل چاہتا سنتے ہی رہیں۔ ایک دن میں فرحت اور مسرت بیٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ فرحت نے کہا تم آج کل اس لڑکی کے گروپ میں کیا کرتی رہتی ہو۔ میں نے کہا میں اسے دیکھتی رہتی ہوں اور اس کے خاندانی جاہ و جلال کے قصے سنتی رہتی ہوں۔ فرحت کہنے لگی مجھے تو وہ بالکل متاثر نہیں کرتی یہ انسانیت کی سراسر توہین ہے جو کتابوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی وہ اپنا بوجھ کیا اٹھائے گی۔ تم نے کبھی اس کی باتوں پر غور کیا ذہانت تو چھو کر بھی نہیں گزری۔ انگریزوں کے پٹھو...... یہ غدار لوگ ہیں جنھوں نے انگریزوں کا ساتھ دے کر جائیدادیں بنائیں۔ بہر حال ہماری اس بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں بہت جلد اس کے حلقۂ احباب سے نکل گئی۔ فرحت سے میری دوستی بڑھتی چلی گئی مجھے یاد ہے اسے اور مجھے ہر نئی چیز سیکھنے کا بے انتہا شوق ہوتا تھا جب تک ہم بات لفظ جملے اور مسئلے کی تہہ تک نہ پہنچتے نیند آتی نہ چین......

ہم ایک دوسرے کے گھر بھی جایا کرتی تھیں۔ فرحت کے والد کا تعلق جماعت اسلامی سے تھا اور بڑے بڑے نامور لوگ ان کے گھر آیا کرتے تھے کیونکہ جماعت اسلامی کی اکثر میٹنگ ان کے گھر میں ہوا کرتی تھیں۔ فرحت کی والدہ اونچی لمبی جوان خاتون تھیں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اس کے فرسٹ کزن تھے۔ ان کے گھر جانگلی زبان بولی جاتی تھی۔

فرسٹ ایئر مکمل کرنے کے بعد میرے والد کی ٹرانسفر جڑانوالہ ہوگئی۔ مسرت سے کچھ عرصہ رابطہ رہا مگر فرحت نسیم ہاشمی سے تو پھر یونیورسٹی تک بہت گہری دوستی کا رشتہ رہا۔

جڑانوالہ آئے تو یہاں لڑکیوں کا کوئی کالج نہیں تھا۔ میرے والدین نے مجھے کہا کہ تم پرائیویٹ امتحان کی تیاری کرو اور میرے بھائی کو کالج میں داخل کروا دیا جائے گا۔

ابھی گرمیوں کی چھٹیاں تھیں یہ بحث جاری تھی۔ یہ بھی سوچا گیا کہ مجھے لڑکوں کے کالج میں داخل کروا دیا جائے۔ میرے بھائی کو پتہ چلا تو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ جس دن نعیم نے میرے کالج میں قدم رکھا وہ کالج میں میرا آخری دن ہوگا۔ بس پھر اسے ہی پڑھائی میں نہیں پڑھوں گا۔ میرے بھائی کے لیے بڑے شرم کی بات تھی کہ اُس کے دوستوں کو معلوم ہو جائے کہ میں اُس کی بہن ہوں۔ میرے پڑھنے یا نہ پڑھنے پر مسلسل سوچ بچار ہو رہا تھا۔ ہر طلوع ہونے والا سورج مجھے شش و پنج میں چھوڑ کر کہیں چھپ جاتا اور میں پھر طلوعِ سحر کی امید لگائے لمبی رات گزار دیتی۔

ان دنوں میرے چھوٹے ماموں کا پیپلز پارٹی میں بہت اثر و رسوخ تھا۔ بڑے ماموں کی بیٹی بھی میری کلاس فیلو تھی۔ سو چھوٹے ماموں نے گرمیوں کی چھٹیوں ہی میں اپنی ذاتی کوششوں سے بچوں کے ایک سکول کو لڑکیوں کے کالج میں بدلوا دیا چھٹیوں میں ہی لیکچرار کا تعین ہو گیا پرنسپل مسز ظفر اللہ چوہدری کا تعین بھی کروا دیا گیا اور یوں چھٹیاں ختم ہوئیں تو ہمارے لیے پوری طرح انٹرمیڈیٹ کالج تیار ہو چکا تھا ہمارے ساتھ اور بھی بہت سی لڑکیوں کا بھلا ہو گیا۔

میں پہلے دن کلاس میں گئی تو مسز ظفر اللہ کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئی وہ کسی وڈیرے کی بیگم تھیں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں۔ انھوں نے اپنے لیکچر میں بہت سی باتیں کیں اُن کی ایک بات آج تک یاد ہے، کہنے لگیں میں ایران پی ایچ ڈی کے لیے گئی تو سردیوں کا موسم تھا میرے پاس صرف ایک کوٹ تھا۔ میں نے دوستوں کے ہمراہ شاپنگ کے لیے جانا تھا۔ سوچا تھا ایک دو کوٹ اور لے لوں۔ میں دوستوں کے انتظار میں لائبریری میں بیٹھ گئی۔ ایک کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک جملے پر نظر پڑی لکھا تھا کوئی چیز خریدتے وقت تین دفعہ سوچو ''آیا مجھے اس کی ضرورت ہے'' اگر تیسری دفعہ بھی دل سے آواز آئے کہ ہاں مجھے اس کی اشد ضرورت ہے تو خرید لو ورنہ خریدنے کا ارادہ ملتوی کر دو۔

میں نے فوراً آنکھیں بند کیں اپنے آپ سے سوال کیا کہ مجھے ایک کوٹ کے ہوتے ہوئے کیا مزید کسی کوٹ کی ضرورت ہے؟ اندر سے آواز آئی ہرگز ضرورت نہیں۔ سو میں نے شاپنگ کا ارادہ ترک کر دیا۔ ہمیں بھی ہدایت کی کہ زندگی میں اس اصول کو ہمیشہ مدنظر رکھو۔

باقیوں کا تو مجھے معلوم نہیں میں اس اصول کو کبھی نہیں بھولی۔

ایف اے میں فرسٹ ڈویژن

ایف اے میں فرسٹ ڈویژن کے بعد میرے گھر والوں کی دبی دبی خوشی کے پیچھے رقصاں تشویش صاف نظر آتی تھی۔ انھیں معلوم تھا کہ اب وہ پھر کالج اور ہوسٹل میں جانے کی ضد کروں گی۔۔ جونہی میں نے ایف اے کا امتحان دیا امی نے کہا اب گھر داری سیکھو اور برقعہ پہن کے گھر سے باہر نکلا کرو۔۔ میرے سخت احتجاج کے باوجود میرا برقعہ سل کر آ گیا۔۔ میں نے صاف انکار کر دیا کہ میں برقعہ نہیں پہنوں گی۔ سزا کے طور پر اب میرے گھر سے نکلنے پر مکمل پابندی لگ گئی۔ کسی بھی کزن کو میرے گھر آنے کی اجازت نہیں تھی۔

امی نے نوکر کو جوان ہونے کی سزا میں گھر کے اندر آنے سے منع کر دیا اور مجھے حکم ہوا کہ آج سے ناشتہ اور کھانا تم تیار کرو گی۔ مجھے یاد ہے میرے والد نے بہلا پھسلا کر بڑے ہی پیار سے مجھ سے ناشتہ بنوایا میں ناشتہ ٹرے میں رکھ کر کمرے میں لا رہی تھی کہ ہاتھوں سے ٹرے گری اور سب کچھ تلپٹ ہو گیا اور میرے والد کوئی بات نہیں کہتے کہتے بغیر ناشتے کے ہی دفتر چلے گئے۔

ہمارے گھر میں اگر کوئی مرد بغیر ناشتے کے دفتر چلا جاتا تو اسے عورت کا پھوہڑ پن سمجھا جاتا تھا۔ مرد چونکہ کما کر لاتا ہے لہٰذا اس کی عزت و تکریم کو اولین فرض کے طور پر جانا جاتا۔

اس واقعے کے بعد کچھ نرمی برتی جانے لگی۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے سخت بور ہو گئی تو ایک دن میں نے اپنی کزن کی طرف جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔۔ امی نے کہا برقعہ پہنو گی تو جاؤ گی ورنہ نہیں جا سکتی۔ بڑی ضد کی مگر امی نے بھی جان لیا تھا کہ یہی وقت ہے اپنی بات منوانے کا!

اور میں مان گئی میرے بھائی نے مجھے سائیکل پر چھوڑ کے آنا تھا۔ راستے میں ایک ویران سی جگہ بھی تھی۔ وہاں میرے بھائی نے دیکھ لیا کہ اس نے امی کے ڈر سے برقعہ تو پہن لیا ہے مگر چہرے

پر نقاب نہیں ڈالا۔ اس نے کہا چہرے پر نقاب ڈالو ورنہ میں یہیں اتار دوں گا۔ میں نے کہا میں نقاب نہیں لوں گی اس نے ہاتھ پیچھے کر کے مجھے ایک مکا رسید کیا میں نے پیچھے سے دو مکوں سے تواضع کی اب ہماری لڑائی جاری تھی۔ اس کے مکے نظر آ رہے تھے میرے مکے نظر نہیں آ رہے تھے۔ اتنی دیر میں ایک بزرگ خاتون نے دیکھ لیا اس نے ہمیں روکا اور پھر بھائی کی خوب تواضع کی۔ وہ بولنے لگا تو اسے اور ڈانٹا اور کہا: بہن کو مارتے ہوئے تمھیں شرم آنی چاہیے۔ میں نے اس کا خوب مذاق اُڑایا اور دھڑلے سے پھر سائیکل پر بیٹھ گئی تھوڑی دور جا کر اس نے مجھے سائیکل سے اتار دیا اور کہا میں تمھیں سائیکل پر نہیں بٹھاؤں گا پیدل چلو اور اگر نقاب نہ لیا تو امی کو جا کر شکایت لگاؤں گا۔ خیر میں نے نقاب اوڑھ لیا ابھی تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ ایک گہرے کھڈے میں جا گری۔ اب میرے بھائی کو تو لینے کے دینے پڑ گئے۔ بڑی مشکل سے مجھے نکالا اور ہم کزن کے گھر جانے کی بجائے واپس گھر آ گئے۔ گھر آ کر میرے بھائی نے امی سے سفارش کی کہ اسے برقعے پر مجبور نہ کیا جائے۔ بہر حال کھڈے میں گرنے کچھ خون نکلنے اور کچھ زخم سہنے سے خیر کا پہلو یوں نکلا کہ میرا برقعہ ہینگر پر ہی لٹکتا رہ گیا اور میں اس کا منہ چڑاتی ہوئی اس سے دور بہت دور نکل گئی۔

میرا فرحت ہاشمی سے روزنامچہ کی طرح خطوط کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا اور ہم ایک دوسرے کے شب و روز سے بخوبی باخبر رہتے تھے۔ تواتر کے ساتھ خط و کتابت زندگی کا حصہ بن چکی تھی جسے گھر والوں نے بھی بہت اچھی طرح قبول کر لیا تھا۔ فرحت ہاشمی نے مجھے خط میں اطلاع دی کہ نعیم بی اے کے داخلے شروع ہو چکے ہیں تم جلدی سے داخلے کے لیے درخواست دے دو۔

آج میں سوچتی ہوں اگر میری فرحت ہاشمی کے ساتھ اتنی مضبوط دوستی نہ ہوتی تو شاید میں کسی مقام پر ہار مان جاتی۔ مجھے متحرک کرنے کے پیچھے میری سب سے بڑی اور اہم طاقت فرحت ہاشمی ہی تھی۔

میں نے جب بی اے میں داخلے کی بات کی تو گھر میں موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ کیونکہ بی اے کے لیے ہوسٹل میں رہنا پڑتا تھا۔ جوان لڑکی گھر سے باہر گھر والوں کی نظر سے اوجھل ہو کر رہے۔ یہ کیسے ممکن تھا۔ امی کا لہجہ سخت ہونے لگا تا کہ میں خود ہی دل برداشتہ ہو کر اپنے دعوے سے ہٹ جاؤں۔

ایسے میں پورا گھر ہی میرا مخالف ہو گیا۔ سیاہ رات نے بھی مجرم سمجھ کر آنکھوں سے نیند چھین لی۔ دن کا اجالا بھی زرد زرد سا ہو گیا اور نرم گرم گود نے بھی شفقت سے محروم کر دیا ہے۔ تب میں نے اپنی ہمت کی جمع شدہ پونجی کو اکٹھا کیا۔ اپنے سسکتے خوابوں کو دلاسہ دیا۔ اپنی ضدی طبیعت کو آواز دے کر جھنجھوڑا۔۔۔ کہ اب نہیں تو کبھی نہیں۔ آؤ مل کر صف بندی کرتے ہیں۔

سخت پابندیوں کے باوجود راستے میں کئی ایسے مقام بھی آئے جنھوں نے جذبات پر دستک دے کر متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر میں نے سب کو دانستہ نظر انداز کیا۔ کیونکہ میں کسی بھی ایسے تجربے کو جواز بنا دینے کے حق میں نہیں تھی۔ جو مجھے آگے بڑھنے سے روک دے۔

جب داخلے بند ہونے کا وقت آ گیا اور میرے گھر والوں نے بھی حتمی طور پر مجھے کسی بھی صورت ہوسٹل نہ بھیجنے کا ارادہ کر لیا تو میں نے بھوک ہڑتال کر دی۔ گھر والے پریشان ہو گئے جب میں نے دو تین دن کچھ بھی منہ میں نہ ڈالا تو گھر والے سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ یہ پاگل لڑکی تو مر جائے گی۔ جب پیار محبت بہلانا پھسلانا سارے تجربے ناکام ہو گئے تو میری شرائط کو قبول کر لیا گیا۔

مجھے یاد ہے جس دن مجھے ہوسٹل کے لیے رخصت کیا گیا۔ گھر میں افسردگی کا عالم تھا میری ایک غیر شادی شدہ پھوپھی ہمارے ساتھ رہتی تھیں انھوں نے صبح تہجد کے ساتھ نوافل ادا کرنے شروع کر دیے اور وہ اتنا روئیں کہ خدا کی پناہ۔۔ امی کی بھی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں ابو بھی پریشان تھے۔

امی نے فجر کے وقت مجھے اٹھا کر نماز پڑھائی اور نصیحت کی کہ اگر کبھی تم ہوسٹل سے باہر نکلی یا مجھے پتہ چل گیا کہ کسی سہیلی کے گھر گئی ہو تو دیکھنا میں تمھارا کیا حشر کرتی ہوں جس آبرو کے ساتھ جا رہی ہو اسی آبرو کے ساتھ واپس آنا اور بھی بہت سی نصیحتیں اور خوفناک دھمکیاں۔۔۔

جس دن مجھے ہوسٹل جانا تھا۔ رونے دھونے اور گھر کے ماحول سے لگ رہا تھا کہ میرا جنازہ جا رہا ہے۔

بہر حال ابو نے میرا بیگ اٹھایا اور دل گرفتہ ہو کر مجھے میری نئی منزل کی طرف چھوڑنے کے لیے چل دیئے۔

فیصل آباد اسلامیہ کالج کا بڑا سا آہنی گیٹ جسے دیکھ کر ہی قید خانے کا گمان ہوتا تھا۔ ابو نے

مجھے وہاں چھوڑتے ہوئے کہا: ابھی بھی سوچ لو داخلہ فیس ضائع ہو جائے گی کوئی بات نہیں۔۔مگر میں اپنے پیچھے جو داستان چھوڑ کر آئی تھی اس کا کیا کرتی۔ بہر حال اب اگلے دو سال کے لیے میرا عارضی ٹھکانہ یہی قید خانہ تھا۔

میرے والد نے گھر جا کر بتایا کہ میں جب نعیم کو اس آہنی گیٹ سے اندر چھوڑ کر باہر آیا تو پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

ادھر میری یہ حالت تھی کہ میں نے جب ہوسٹل کا یہ آہنی گیٹ دیکھا تو پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے اور آنکھوں میں چھپے طوفان کو بڑی ہی مشکل سے ہوا میں اُڑتے چنچل آنچل سے خشک کیا۔

مجھے میرا کمرہ دکھا دیا گیا۔۔ایک بڑے سے کمرے میں بارہ چارپائیاں آمنے سامنے لگی ہوئی تھیں۔ان میں سے ایک چارپائی مجھے الاٹ کر دی گئی۔ہم سب لڑکیاں ایک دوسرے سے نظریں چرا کر اداس پنچھیوں کی طرح بیٹھی تھیں کہ ٹن ٹن گھنٹی بج گئی معلوم ہوا یہ رات کے کھانے کی گھنٹی ہے کھانے کے بعد ہمیں سینئرز کے سامنے پیش ہونا ہے۔

کھانا دیکھتے ہی چودہ طبق روشن ہو گئے اور سارے کس بل نکل گئے۔پتلی مونگ کی دال کے ساتھ چپاتی۔دال کا رنگ اور ذائقہ انتہائی بدمزہ۔۔تھوڑا سا زہر مار کیا۔

کھانے کے بعد ڈرتے ڈرتے سینئرز کے سامنے پیش ہوئے۔انھوں نے ہماری وہ گت بنائی کہ خدا کی پناہ۔

کبھی مرغا بنو کبھی دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو جاؤ کبھی گانا سناؤ۔۔کبھی اپنا بیگ کمرے سے لا کر چیک کرواؤ۔۔سب سینئرز نے ہمارا بہت مذاق اڑایا،سینئرز کا گروپ بیٹھ جاتا اور ہم مجرموں کی طرح ان کے سامنے کھڑے ہو جاتے۔یہ سلسلہ کئی دنوں تک چلا۔بعض لڑکیاں تو رونے لگ جاتیں۔۔خیر ہمارے کئی دن روتے دھوتے گزرے۔

سینئرز کی اچھی خاصی دھاک ہم پر جم چکی تھی اور وہ جب بھی کبھی ہمارے سامنے آتیں ہم تھر تھر کانپنے لگتے۔ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ میں اپنے بیڈ پر لیٹی تو نیند نہیں آ رہی تھی گھر بری طرح یاد آ رہا تھا۔۔میں نے اپنے گھر خط لکھنا شروع کر دیا۔۔۔خط کیا تھا معافی نامہ تھا۔۔اپنی غلطی کا اعتراف تھا۔۔پشیمانی کا اظہار تھا۔۔۔اور آئندہ کبھی بھی ضد نہ کرنے اقرار تھا اور ان سب

باتوں کے بعد منت سماجت کے بعد یہ لکھا کہ مجھے یہاں سے واپس لے جائیں میں خط لکھتے ہوئے اتنا روئی کہ میرے آنسوؤں سے انک پین کی سیاہی اور آنسوؤں سے تکیہ بھیگتا رہا اور ایسے میں ہی میں کسی پہر سوگئی۔ صبح آنکھ کھلی تو وارڈن راؤنڈ لے رہی تھیں اس نے میری حالت دیکھی تو پیار سے وہ خط لے لیا اور مجھے تسلی دی کہ میں خود یہ خط پوسٹ کردوں گی۔ میں مطمئن ہوگئی اور پھر کئی دن تک انتظار کرتی رہی کہ ابھی نیچے گیٹ سے آواز آئے گی اور میرے والد مجھے آ کر لے جائیں گے۔۔کئی دن اسی انتظار میں گزر گئے میرے والد صاحب تو نہ آئے مگر میرا دل لگنے لگا۔ بہت عرصے بعد پتہ چلا کہ وارڈن نے تو وہ خط پوسٹ ہی نہیں کیا تھا۔

ایک دن اسی طرح میں اداس پھر رہی تھی کہ ایک بہت پیاری سانولی سی لڑکی ملی جو مجھ سے سینئر تھی اُس نے مجھے بلایا اور پوچھا اداس ہو؟ میں چھم چھم رونے لگی۔اس نے پاس بٹھایا اور بہت پیار کیا اور پوچھنے لگی تم کہاں سے آئی ہو تمھارا گاؤں کون سا ہے؟

میں نے جب بتایا تو اچانک اس نے تڑپ کر پوچھا تم کس کی بیٹی ہو؟ میں نے کہا رحمت اللہ کی۔۔۔

کہنے لگی سلطان احمد کیا لگتے ہیں تمہارے۔۔میں نے کہا وہ میرے تایا ہیں۔

اس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں اور کہنے لگی میں اسی کی تو بیٹی ہوں۔

نام تو میں نے بھی سنا ہوا تھا کچھ دیر تک تو ہم ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتی رہیں۔لفظ روٹھ گئے۔ پلکیں بھاری ہوگئیں اتنی کہ اٹھائی نہ جائیں۔ پھر وہ اٹھیں اور میرے گلے لگ گئی ڈھیر ساری باتیں ہوئیں۔

اس نے مجھ سے پوچھا تمہارے تایا تم سے ملنے آئیں گے میں نے کہا ہاں ضرور آئیں گے۔

کچھ توقف کے بعد اس نے کہا انھیں ہرگز نہ بتانا مگر مجھے ان کی شکل ضرور دکھا دینا۔

میں نے بھی وعدہ کرلیا۔ کچھ دنوں کے بعد میں نے محسوس کیا وہ مجھے دیکھتی تو رہتی ہے مگر ملنے سے گھبراتی ہے۔

یا پھر ملنا نہیں چاہتی۔

یہ بچیاں بہت چھوٹی تھیں جب میرے تایا نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔تایا نے بچیوں کے حصول کے لیے بہت کوشش کی مگر بچیوں کی والدہ نے زندگی بھر میرے تایا کو ان کی شکل بھی نہ دکھائی۔ بزرگوں سے سنا تھا کہ جب یہ بچیاں اسکول میں داخل ہوئیں تو میرے تایا نے بہت کوشش کی کہ ملاقات ہو جائے۔ایک دفعہ کوشش کر کے ان تک پہنچ بھی گئے مگر بچیوں کو پتہ چلا تو انھوں نے پتھر مارے۔ یہ وہ تربیت تھی جو ان بچیوں کو دی جاتی تھی یہ بھی سنا تھا کہ اس کے بعد تایا نے دوبارہ کبھی ملنے کی کوشش نہیں کی۔مگر پھر بھی انھیں دھڑ کا لگا رہا کہ کہیں باپ چھین کر نہ لے جائے۔ہمیں بھی صرف نام ہی معلوم تھے۔

رشتوں میں زہر کی ترسیل تو رہی مگر تریاق کی ضرورت کبھی نہ محسوس ہوئی۔

کچھ عرصے بعد معلوم ہوا اس نے ہوسٹل چھوڑ دیا ہے اور وہ کسی رشتے دار کے گھر چلی گئی ہے۔ایک ملاقات میں اس نے مجھے بتایا کہ ہماری اس ملاقات کا اپنے تایا سے ذکر نہ کرنا۔

میں نے گھر میں ذکر کیا تو مجھے بھی ملنے سے روک دیا گیا۔میرے گھر والوں کا خیال تھا کہ وہ بچی کے ذریعے کوئی انتقامی کارروائی نہ کریں۔ کیونکہ جائیداد کے مسئلے بھی چل رہے تھے۔میں سوچتی ہی رہ گئی کہ رشتے کیا ہوتے ہیں اور اگر رشتوں میں چھید ہو جائیں تو رفو گیری کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

بہر حال ہوسٹل میں آہستہ آہستہ میرا دل لگ گیا اور میری ان درجن بھر لڑکیوں سے بھی خوب دوستی ہوگئی۔ پھر تو ہم خوب ہلہ گلہ کرتے لطیفے سناتے ناچتے گاتے محفلیں جماتے اور خوب مزے اڑاتے۔ایک طرف سے کوئی جگت آتی دوسری اس کا جواب دیتی تیسری ناراضگی کا اظہار کرتی چوتھی اس کے ساتھ مل جاتی پانچویں بیچ سے کوئی اور نقطہ نکال لیتی چھٹی چپ کرانے میں لگ جاتی ساتویں شرم دلاتی۔کوئی اور غصے سے بولتی کوئی اور بیچ بچاؤ کرانے لگتی۔۔رنگ رنگ کے مزاج رنگ رنگ کے ہنر رنگ رنگ کی باتیں سب لڑکیوں کے خوب خوب جوہر کھلنے لگے۔

میرے دائیں بائیں والی دو لڑکیاں اردو سپیکنگ تھیں جو بھکر سے آئی تھیں۔دونوں بہت ہی سلیقے والی اور تمیز دار تھیں۔اکثر چپ رہتیں انھوں نے اپنے اوپر تہذیب کا ایسا لبادہ اوڑھا ہوا تھا کہ ہم سب ان سے بالواسطہ مذاق کرنے کی جرات نہ کرتے البتہ بلا واسطہ اشاروں کنایوں سے

انھیں خوب مذاق کا نشانہ بناتے۔

ہمارے کمرے میں کوئی الماری نہیں تھی ایک چار پائی اور سرہانے رکھا صندوق ہی ہماری کل کائنات تھا۔ اسی میں کپڑے اسی میں کاپی پین اور کتابیں۔ اسی میں گھروں سے لائی ہوئی پنیاں یا لڈو وغیرہ جو اکثر چوری ہو جایا کرتے تھے اور یہ چوری بہت سی لڑکیاں مل کر منصوبہ بندی سے کرتی تھیں۔ باتھ روم کمروں سے الگ تھے کپڑے دھونے کے لیے دھوبی تھا۔

میری دائیں بائیں والی دوستیں اپنے میلے کپڑے بھی انتہائی سلیقے سے تہہ لگا کر اپنے تکیے کے ساتھ رکھا کرتی تھیں جوتوں کی سمت بھی متعین ہوتی۔ دھلے ہوئے کپڑے بھی سلیقے سے صندوق میں رکھتی تھیں۔ میں تو تھی ہی لا ابالی گھر میں تو کسی نہ کسی طرح یہ کام ہو ہی جاتے تھے یہاں آکر یہ سب کام میں نے ان دونوں کو دیکھ کر سیکھے۔

وہ اکثر میرے تلفظ کا بھی مذاق اڑاتیں۔ جس سے میں بہت محتاط ہو کر بولتے بولتے اردو سپیکنگ ہی بن گئی کیونکہ بعد میں ساری زندگی مجھے ہر کوئی پہلا سوال یہی کرتا کیا تم اردو سپیکنگ ہو۔۔

اچھا ہم تو سمجھے تھے تم اردو سپیکنگ ہو!

آہستہ آہستہ زندگی کروٹیں لیتے ہوئے انگڑائیوں تک پہنچ گئی۔

اور میں گھر سے درآمد شدہ سارے خوف ایک گٹھڑی میں باندھ کر دو سال کے لیے صندوق کے پیچھے رکھ کر بھول گئی۔

ہوسٹل سے گھر تک

ہوسٹل سے گھر آنے پر زندگی بدل کے رہ جاتی۔ سب سے پہلے تو میرے لمبے حسین بال میرے لیے مشکلات پیدا کرتے۔ مجھے الگ بستر پر سلایا جاتا امی کا خیال تھا کہ میں ہوسٹل میں نہ جانے کن کن لڑکیوں کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی ہوں یقیناً میرے بالوں میں جوئیں ہوں گی اس خیال کی تفتیش یوں ہوتی کہ ایک ماسی صبح ہی ہمارے گھر آ جاتی اور اس کا کام صرف یہ ہوتا کہ میرے سر کے ہر بال کو ٹٹول کر دیکھا جائے اور اگر کوئی جوں بر آمد ہو جاتی تو گھر میں سنسنی سی پھیل جاتی پھر تو کنگھی کو بھی الگ رکھا جاتا کنگھی کو میرے سر کی سیر کے بعد باقاعدہ غسل صحت کرنا پڑتا۔

وہ ماسی یاد آتی ہے تو دل سے اس کے لیے مغفرت کی دعائیں نکلتی ہیں۔ ہماری زندگی نہ جانے کس کس کی قرض دار ہے ماسی بیری کے پتوں کی جھاگ بنا کر میرے بال دھویا کرتی میرے سر میں تیل کی مالش کیا کرتی اور میرے لیے آلو والے چاول پکایا کرتی تھی جو مجھے بہت مرغوب تھے۔

کئی دنوں کے بعد جب امی کو یقین ہو جاتا کہ اس کے بال جوؤں سے پاک ہیں تب مجھے گھر کے باقی بستروں پر اٹھنے بیٹھنے کی اجازت ہوتی۔

میرے آنے پر کوئی مرد مددگار گھر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا بنگلے میں ہر شخص کو معلوم ہو جاتا کہ چھوٹی بی بی آ گئی ہے۔ جب مرد مددگار کو کسی کام کے سلسلے میں گھر میں آنا پڑتا تو سب سے پہلے مجھے کہا جاتا کہ کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لو تب وہ لڑکا گھر میں آتا اپنا کام کرتا اس کے چلے جانے کے بعد ہی مجھے کھلی فضا میں آنے کی اجازت ملتی۔

ایک دفعہ ایک ملازم جس کا نام عاشق تھا۔ اسے نام بدلنے کے بعد ملازمت دی گئی۔ میری

امی کا خیال تھا یہ نام انتہائی نامناسب ہے اگر کبھی میری بیٹی کو آواز دے کر بلانا پڑا تو یہ قابلِ اعتراض ہوگا۔

میرے پہلے رشتے کے چرچے تو ہوش سنبھالتے ہی شروع ہو گئے تھے جس پر امی ابو کی لڑائی ہو جاتی اور گھر پانی پت کا میدان بن جاتا۔ دوسرا رشتہ بھی اسکول کے زمانے میں ہی آیا تھا ایک بزرگ ہمارے گھر آ کر براجمان ہو گئے۔ ان کا ایک جملہ بچپن کے جھٹ پٹے سے جھانکتا ہوا یاد آ جاتا ہے ''اس رشتے سے پرانی باڑ کو چھاپا لگ جائے گا۔''

یعنی پرانے رشتوں کو پھر سے زندگی مل جائے گی۔

مجھے یاد ہے وہ بزرگ جب ڈھٹائی سے گھر میں بیٹھ ہی گئے تو ایک دن میرے والد نے بھائی سے کہا اسے گردو پیش کی سیر کے بہانے موٹر سائیکل پر بٹھاؤ، اس کا سامان ساتھ رکھو اور اسے بسوں کے اڈے پر چھوڑ کر آ جاؤ۔ سو بڑے ہی طریقے سے ان سے جان چھڑوائی گئی تھی۔

میٹرک کا امتحان تھا ابو نے ایک کالج کے گولڈ میڈلسٹ لیکچرار سے کہا کہ میرے بچوں کو ٹیوشن پڑھا دیا کرو اس نے کچھ ہفتے پڑھایا اور پھر یکا یک آنا بند کر دیا۔ تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ اُس نے مجھے پڑھانے سے انکار کر دیا ہے۔ ابو کو بہت بُرا لگا کہ یہ کیا بات ہوئی۔ نزدیک کہیں سے کوئی ٹیوٹر نہ ملا تو فیصلہ ہوا وہ بھائی کو پڑھائے گا اور پھر بھائی مجھے پڑھائے گا۔

میٹرک کا امتحان ختم ہوا تو ایک بزرگ خاتون بیرون شہر سے ہمارے گھر آ گئیں۔

معلوم ہوا یہ اس گولڈ میڈلسٹ کی والدہ ہیں جو اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آئی ہیں۔ خاتون کو تو جواب دے دیا گیا مگر اس رشتے نے میرے ذہن میں بغاوت کا عنصر پیدا کر دیا۔ مجھے لگا شادی زندگی کے تجربات مشاہدات اور اسرار رموز کو کھوجنے پر فل سٹاپ کا نام ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مجھے لگتا تھا پورا گھر میری ہی تربیت میں لگا رہتا ہے۔ اب تو والد اور بھائی میری زندگی کے فیصلے کرتے ہیں پھر میری زندگی میں نیا آنے والا مرد کیا کرے گا تو زندگی کبھی بھی نہیں بدل سکے گی۔ میں بہت مختلف سوچ کی حامل تھی اور ایک عامیانہ سی زندگی نہیں گزارنا چاہتی تھی۔

سو میں نے فیصلہ کیا کہ میری زندگی کے ساتھ اب یہ تماشا نہیں ہوگا۔ مجھے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے اپنے تمام گھر والوں کے ذہنوں کو بدلنا ہے اور ان میں اپنے ہونے کا احساس پیدا کرنا ہے اپنے بھائی کے مقابل کھڑے ہو کر اپنے حصے کا حق وصول کرنا ہے۔ ہر رشتے کے ذہن میں اپنے لیے گنجائش پیدا کرنی ہے۔

اس کے علاوہ مجھے اس بات کا بھی شدت سے احساس ہو گیا تھا کہ مجھے آزادی کا جو وقت ملا اس سے بھرپور فائدہ اٹھانا ہے اور ایک پل کو بھی ضائع نہیں کرنا۔

بس پھر یہ ہوا کہ ساری پابندیاں قید و بند کی ساری زنجیریں میری ضد کے آگے ہتھیار ڈالتی رہیں اور میں اپنا راستہ بناتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ بلاشبہ راستہ ہموار تو نہ ملا بڑی محنت اور مشقت سے ہموار کرنا پڑا۔ ہوسٹل کالج اور یونیورسٹی کا زمانہ بھرپور طریقے سے گزارا جینا سیکھا...... ہنسنا سیکھا۔ زندگی کے اسرار و رموز سیکھے۔ بولنا سیکھا اپنا حق وصول کرنا سیکھا۔ زندگی کی روش سے ہٹ کر سوچنا سیکھا۔ تحقیق اور جستجو سے راہوں کو استوار کرنا سیکھا۔

باغی اور سرکش ٹھہری، نافرمان بھی، ضدی بھی مگر اپنی حدود میں رہ کر زندگی سے اپنے لیے رستے تلاش کرتی رہی۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں ہوسٹل گئی تو میرا دل لگ گیا۔

ہار ہو جاتی ہے جب مان لیا جاتا ہے
جیت تب ہوتی ہے جب ٹھان لیا جاتا ہے

وقت پر لگا کر گزرتا رہا اور میں پوری طرح ہوسٹل کے قیام کے دوران اس ماحول میں رچ بس گئی۔

کسی بھی ادارے کا سربراہ اپنی شخصیت کے ہنر کے ساتھ کس طرح ماحول کو بدلتا ہے۔ آج بھی اپنی وارڈن کو یاد کرتی ہوں تو اس کا احساس بڑھ جاتا ہے۔

ہوسٹل میں ہماری وارڈن زبردست شخصیت تھیں۔ درمیانے قد کی گوری چٹی خاتون۔ ان کی نیلی آنکھیں تھیں بہت نفیس ریشمی لباس زیب تن کیا کرتیں تھیں۔ وہ غیر شادی شدہ تھیں۔ ہمیشہ خوشبو لگا کر راؤنڈ لینے نکلتیں ان کی آمد کی اطلاع گرد و پیش پھیلی ہوئی خوشبو سے ہی ہو جایا کرتی تھی۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ ہم اپنی صفیں درست کر لیا کرتے تھے۔ انھیں ہوسٹل کی ایک ایک لڑکی کی خبر ہوتی ہر ایک کے حالات سے آگاہ ہوتی تھیں اور تمام مسائل بڑی ہی خوش اسلوبی سے

حل کرلیا کرتی تھیں۔ بارعب بھی تھیں۔ کبھی کسی سے بے تکلف نہیں ہوتی تھیں۔ بس کام سے کام رکھتی تھیں۔ ہم سب ہوسٹل کی طالبات اِن سے تھر تھر کانپتی تھیں۔ نفاست پسند اتنی تھیں کہ پورے ہوسٹل میں ان کی نفاست کی جھلک نظر آتی تھی۔ ہوسٹل کا کوئی کمرہ بکھرا ہوا نظر نہیں آتا تھا اگر کوئی لڑکی بغیر بستر بنائے کمرے سے چلی جاتی تو اسے کلاس روم سے بلوا کر بستر ٹھیک کرواتیں اور فائن بھی کیا کرتی تھیں۔ ہمارے ڈائننگ ہال میں میز صاف شفاف اور روٹی کے دسترخوان ہر کھانے کے بعد دھلتے تھے۔ ڈائننگ ہال کھانے کے وقت خود حاضر رہتی تھیں اور لڑکیوں کو کھانے کے آداب سکھاتی تھیں۔ کسی کی کیا مجال جو پلیٹ صاف کر کے نہ اٹھے۔ یا کسی بھونڈے طریقے سے کھائے یا اپنی پلیٹ میں زیادہ ڈالے...... گھنٹی کی آواز کے ساتھ ہم سب کھانے کے کمرے میں داخل ہوتیں اور گھنٹی کی آواز کے ساتھ ہی کھانے کا وقت ختم ہو جاتا اور ہمیں جلدی جلدی اپنا کھانا ختم کر کے خواہ پیٹ بھرا ہوا ہو یا بھوکا ہمیں ہر حال میں ڈائننگ ہال سے باہر آنا ہوتا تھا۔ ہمارے ہوسٹل میں سات سے آٹھ بجے تک سٹڈی ٹائم ہوتا، آٹھ سے نو کھانے کا اور آدھا گھنٹہ دانت صاف کرنے اور کپڑے بدلنے کا...... اس کے بعد ساڑھے نو بجے بتیاں بند ہو جاتی تھیں کیونکہ یہ ہمارا سونے کا وقت ہوتا تھا۔ اس کے بعد وارڈن چپکے چپکے راؤنڈ لیا کرتی تھیں اور ٹارچ کی روشنی میں دیکھا کرتی تھیں کہ کسی چارپائی پر دو لڑکیاں تو نہیں سو رہیں یا کوئی لڑکی ادھر ادھر تو نہیں...... ان تمام حدود و قیود کو وہ خود مانیٹر کیا کرتی تھیں۔

جب میں میٹرک میں تھی تو مجھے ایئر ہوسٹس بننے کا بہت شوق تھا۔ کافی عرصہ اس کے خمار میں رہی۔

مگر جب کالج پہنچی تو میری آئیڈیل میری وارڈن ہی تھی اور میں چاہتی تھی کہ کسی ہوسٹل کی وارڈن بنوں گی۔ یہ خواب آج تک خوابوں کے پس منظر میں زندہ ہے۔

ایک دن کیا ہوا ہوسٹل کی ماسی میرے کمرے میں آئی اور کہا آپ کو وارڈن بلا رہی ہیں......

میری تو جان ہی نکل گئی میری روم میٹ نے بھی مجھے غور سے دیکھا۔ کوئی مسکرائی کسی نے حیرت سے دیکھا کسی بے تکلف نے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے ڈرانے کی کوشش بھی کی۔

خیر میں وارڈن کے کمرے میں چلی گئی...... وارڈن بستر پر لیٹی ہوئی تھیں۔ ساتھ والی کرسی پر

مجھے بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا میں ڈرتے ڈرتے بیٹھ گئی۔ وہ کافی دیر مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ بالآخرانھوں نے مجھے کہا کہ میرے سر میں اکثر درد رہتا ہے۔ مہینے کے پہلے ہفتے میں ہوسٹل کی فیس لے کر رسید دینی ہوتی ہے۔ میں چاہتی ہوں اگر پڑھائی میں حرج نہ ہو تو آپ اس سلسلے میں میری مدد کروا دیا کریں۔

میرے لیے تو یہ بہت ہی اعزاز کی بات تھی سو میں نے بخوشی ذمہ داری سنبھال لی۔ بس پھر کیا تھا کچھ ہی دیر بعد میں وارڈن کی بہت چہیتی ہوگئی اور وارڈن ہر کام میں مجھ سے مشورہ کرنے لگیں۔ حتیٰ کہ ہوسٹل میں چیکنگ کا مرحلہ میرے حوالے کر دیا گیا۔ ہمارے ہوسٹل میں الیکشن تو نہیں ہوتے تھے وارڈن ہی ہیڈ گرل کی سلیکشن کرتی تھیں لہٰذا وارڈن نے مجھے سلیکٹ کر لیا بس پھر کیا تھا پورے ہوسٹل کی لڑکیاں میری مٹھی میں تھیں اور ہوسٹل میں میرا ہی راج تھا۔

میرے حوصلے بڑھنے لگے اور اب مجھے کالج میں بھی نمایاں ہونے کا شوق ہوا۔

لائبریرین سے تو میری دوستی پکی تھی۔ چونکہ مطالعے کا بہت شوق تھا لائبریرین نے دیکھا کہ یہ لڑکی کتابیں لے کر جاتی ہے اور ہمیشہ وقت پر ذمہ داری کے ساتھ واپس بھی کر دیتی ہے۔ اعتماد اتنا بڑھا کہ اس نے مجھے اجازت دے دی کہ میں اپنی مرضی سے بغیر رجسٹر میں لکھے جو کتاب چاہوں لے جاؤں۔ ہمارا ہوسٹل کالج کے اوپر دوسری منزل پر ہی تھا۔ سو بہت سی ایسی جگہیں مل جاتی تھیں۔ جہاں ہم بیٹھ کر یکسوئی کے ساتھ مطالعہ کر سکتے تھے۔ میں جب گھر کے لیے اداس ہوتی تو میری بہترین دوست کتاب میرا ہاتھ تھام لیتی مجھے گلے لگاتی میرا دل بہلاتی اور میری بہترین غم خوار بن جاتی۔

مجھے کالج میں نمایاں ہونے کا شوق ہوا تو سب سے پہلے میں نے قرآن پاک کی قرات سیکھی۔

میری عادت تھی کہ میں جس کام کے پیچھے پڑ جاتی اس کے لیے جان لڑا دیتی۔ مجھے یاد ہے کہ قرآن کے سبق کو بلند آواز سے پڑھنا ہوتا تھا جس کے لیے میں صبح اٹھتی اور چھت پر جا کر بلند آواز میں اپنے سبق کی مشق کیا کرتی تھی۔ چند ہی دنوں میں میں نے سورہ فیل کو پکا کر لیا اور میں نے اسمبلی میں اس کی تلاوت شروع کر دی۔

کالج آ کر بھی فرحت ہاشمی سے میری خط و کتابت کے سلسلے کا تسلسل نہیں ٹوٹا تھا۔ ہمارے خطوط کے بارے میں ہوسٹل میں میری تمام سہیلیوں اور وارڈن کو بھی معلوم تھا۔

کالج میں ایک دفعہ پنجابی ڈیبیٹ کا پروگرام بنا تو میں نے بغیر سوچے سمجھے اس میں نام لکھوا دیا۔ سہیلیوں نے بہت مذاق اڑایا لیکن مجھے اس کا حصہ بن کر بہت مزا آیا۔

پھر ڈرامیٹک سوسائیٹی نے ایک ڈرامہ کروایا تو میں نے اس میں بھی ٹانگ اڑائی کھیلوں کے مقابلے کا بھی حصہ بنتی رہی۔ مقابلۂ تقاریر کے سلسلے میں شہر سے باہر بھی جانے کے تجربات سے گزرتی رہی۔ مقابلہ تقاریر میں کبھی نمایاں پوزیشن تو نہ آئی مگر میں نے ہمت کبھی نہیں ہاری۔ ان دنوں ہمارے کالج میں این سی سی کی ٹریننگ شروع ہوئی تو اس لسٹ میں سب سے پہلا نام میرا تھا۔ اس طرح میرے حوصلے بڑھتے رہے اور میں دھیرے دھیرے آگے بڑھتی رہی اور سال گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا۔

اسلامیہ کالج میں سالانہ الیکشن کا وقت آ گیا اور اس کی تیاری زور و شور سے شروع ہوگئی۔ ہوسٹل کی دوستوں نے کہا کہ تم الیکشن لڑو ہم بھرپور ساتھ دیں گے۔ میں نے کئی دن سوچ بچار کے بعد ہیڈ گرل کے لیے اپنا نام لکھوا دیا۔

میری ایک کالج کی دوست شگفتہ عالم مجھ سے بھی پہلے اپنا نام لکھوا چکی تھی اور ہلکی پھلکی کمپین بھی شروع کر چکی تھی۔ اسے جب پتہ چلا کہ میں بطور ہیڈ گرل کھڑی ہو رہی ہوں اسے یہ بھی معلوم تھا کہ مجھے ہوسٹل سٹوڈنٹ کی بھرپور حمایت حاصل ہے تو وہ میرے پاس آئی اور اس نے کہا کہ میں جانتی ہوں تم ہوسٹل میں کافی پاپولر ہو...... تم یقیناً جیت بھی جاؤ گی مگر میں چونکہ پہلے کمپین شروع کر چکی ہوں لہٰذا ہم کیوں نہ اکٹھے مل کر الیکشن لڑیں...... تم اسسٹنٹ ہیڈ گرل کے لیے اپنا نام لکھوا دو عہدے سے کیا ہوتا ہے۔ مقام تمھارا ہیڈ گرل کا ہی ہوگا بس نام میرا ہوگا۔ میرے گھر والوں کو بھی میرے الیکشن لڑنے کا بہت شوق ہے اور مجھے ان کی فل سپورٹ بھی حاصل ہے۔

میں نے ہیڈ گرل کے طور پر اپنا نام تو لکھوا دیا مگر مجھے جلد ہی معلوم ہوگیا کہ اس میں اچھے خاصے بجٹ کی ضرورت ہے جو میرے پاس نہیں ہے۔ بینرز چھپوانے کارڈ بنوانے اور دوستوں میں کھانے پینے کا سلسلہ وغیرہ اور مجھے اپنے گھر والوں کی سپورٹ بھی نہیں تھی۔ بلکہ میرے گھر والوں

کوتو معلوم ہی نہیں تھا کہ میں کالج میں لیڈری کرتی پھر رہی ہوں اور خوف بھی تھا اگر انھیں معلوم ہو گیا تو نجانے کیا ہو۔

دوسری طرف پرنسپل ہمارے پینل کے سخت خلاف تھی۔ وہ کئی سالوں سے بطور ہیڈ گرل اپنی پسند کی لڑکی ہی لا رہی تھی۔ ہمارے مقابل جو لڑکی تھی وہ انگریزی اسکول کی پڑھی ہوئی تھی بہت اچھی طرح ڈریس اَپ ہوتی اور خاصی جاذبِ نظر بھی تھی۔

میرے حالات تو ویسے ہی دگرگوں تھے اور مجھے جو رقم گھر سے ملتی تھی وہ بمشکل میری ضروریات ہی پوری کرتی تھی۔ معاشی حالات کے پیشِ نظر میں الیکشن لڑنے کی متحمل نہ تھی۔ میں نے شگفتہ کی بات مان لی۔ زبردست پینل بنایا اور بھرپور کمپین شروع کر دی۔ میری ہوسٹل فیلوز کو اعتراض ہوا کیونکہ وہ مجھے ہیڈ گرل بنانا چاہتی تھیں مگر میں نے ان سب کو بھی قائل کر کے منالیا۔

شگفتہ بہت پیاری معصوم اور بھولی بھالی سی لڑکی تھی میں جو کہتی مان لیتی جیسا کہتی کر لیتی اس لیے مجھے کسی قسم کا مسئلہ نہیں تھا۔ پورے کالج میں جھنڈیاں اور بینرز لگ گئے۔ پمفلٹ بنے اور نجانے کیا کیا...... شگفتہ کو گھر والوں کی مکمل سپورٹ تھی اور وہ دل کھول کر پیسہ لگا رہی تھی۔ میں پوری طرح اس میں مصروف تھی۔ کہ ایک دن ایک اور واقعہ ہوا......

چھٹی کا دن تھا مجھے وارڈن سے اطلاع ملی کہ مجھ سے میرا کوئی کزن ملنے آیا ہے۔

اسلامیہ کالج کے ہوسٹل کا ماحول بہت سخت تھا یہاں صرف وہی لوگ ملنے آسکتے تھے جن کی لسٹ والدین نے دی ہوئی ہوتی تھی۔ کسی صورت بھی کوئی غیر متعلقہ شخص یہاں پَر بھی نہیں مار سکتا تھا۔ ہماری وارڈن بھی اس معاملے میں بہت ہی سخت تھی۔ وہ تو دو لڑکیوں کو اکٹھا بیٹھنے نہیں دیتی تھی کجا کہ کسی اجنبی سے ملنے دیں۔

میں وارڈن کے پاس گئی تو انھوں نے کہا تمھارا کزن تم سے ملنے آیا ہے جاؤ مل لو......

میں حدِ ادب میں کچھ بھی تو نہ بول سکی اور لرزتے قدموں سے سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے کلاس روم میں چلی گئی جہاں میرا کزن میرا انتظار کر رہا تھا۔

میں اس راز سے ناواقف تھی کہ کس طرح وہ وارڈن سے اجازت لے کر یہاں تک پہنچا۔ یا پھر یہ کہ چونکہ وارڈن کی بہت چہیتی اور قابلِ اعتماد تھی اس لیے انھوں نے اجازت دے دی۔

نجانے یہ معجزہ کیسے رونما ہوا۔

میرے اس کزن نے مجھ تک پہنچنے کے لیے اس سے پہلے بہت پاپڑ بیلے...... میرے بچپن میں ان کے والد ہمارے گھر میں پھلوں کے ٹوکرے لے کر آتے مجھ سے بے انتہا پیار کرتے اور واپسی پر روتے ہوئے ہمارے گھر سے جاتے کیونکہ اس موضوع پر ہمارا گھر پانی پت کا میدان بن جاتا۔ شروع میں تو مجھے سمجھ ہی نہیں آتی تھی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔

آہستہ آہستہ جب میں بڑی ہوئی مجھے احساس ہوا تو میں خوفزدہ سی رہنے لگی۔ مجھے یاد ہے میرا یہ کزن ہمارے گھر رہنے کے لیے بھی آ جاتا تھا۔ اس کی موجودگی میں امی کا رویہ اتنا سخت ہو جاتا تھا۔ کہ مجھے شیر کی نظروں کا سچ مچ گمان ہونے لگتا۔ مجھے اس کی موجودگی میں خوشبو لگانے کی اجازت نہ تھی نہا کر بال کھول کر سکھانے کی اجازت نہ تھی زیادہ دیر بند کمرے میں رہنے پر مجبور کیا جاتا اگر نادانستگی میں بھی کچھ گستاخی ہو جاتی تو اس کے سامنے ہی وہ سرزنش ہوتی کہ خدا کی پناہ......

ایک دفعہ کمرے سے گزرتے ہوئے اس نے مجھ سے پانی پلانے کی فرمائش کر دی۔ میں نے ابھی پانی کا گلاس پکڑایا نہیں تھا کہ امی نے دیکھ لیا ایسی گرج دار آواز آئی کہ گلاس میرے ہاتھ سے گرا اور اس کی کرچیاں کمرے میں بکھر گئیں۔ اور وہ پیاسا ہی اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔ وہ بھی جانتا تھا کہ اُس کا آنا نعیم پر بہت بھاری گزرتا ہے مگر پھر بھی وہ وقتاً فوقتاً آ جاتا۔ زندگی بھر ہمارے درمیان کبھی کسی ایک جملے کا بھی تبادلہ نہ ہوا تھا۔ بس کبھی کبھار میری آنکھوں کی بے بسی اور اس کی آنکھوں سے نکلتی شعائیں پلکوں میں چھپی نظروں سے بغاوت کر کے ایک دوسرے کی ذرا سی جھلک دیکھنے کے لیے راستہ بنا لیتیں۔ دھیرے دھیرے میرے اندر ایک خوف زدہ ڈری ڈری سہمی سہمی سی کشش نے بسیرا کر لیا اور غیر یقینی کے لرزتے رستوں پر نظریں چرا کر ننگے پاؤں چلنے لگی۔

میرا کزن مایوس نہیں ہوا اور اس نے پورے خاندان کو قائل کر کے اپنے ساتھ ملا لیا میری دادی حیات تھیں اور وہ بھی پوری طرح مورچے سنبھال کر اس کے ساتھ مل گئیں۔

ایک طرف پورا خاندان اور دوسری طرف میری والدہ...... میرے والد اکثر ڈانواں ڈول ہو جاتے کبھی تو وہ اپنے بہن بھائیوں سے مل جاتے اور کبھی امی کے ساتھ کھڑے ہو جاتے۔ ایک دفعہ میری دادی ہمارے گھر رہنے آئیں یہ موضوع بڑے زور شور سے چل رہا تھا۔ دادی مجھے پاس بٹھا

لیتیں کچھ پڑھ کے پھونکتی رہتیں۔امی نے خود تو کچھ نہ کہا......ایک دن ابو نے مجھے اپنے پاس بلایا اور بہت پیار سے سمجھایا کہ دیکھو بیٹا......اپنی اپنی ماؤں سے پیار کرنا چاہیے تم اپنی ماں سے پیار کیا کرو میں اپنی ماں سے کروں گا......میرے حصے کا سارا پیار میری ماں سے لے لیتی ہو یہ سراسر ناانصافی ہے......

ابو نے یہ بات مذاق سے کہی تھی مگر میں سمجھ گئی تھی کہ کون کہہ رہا ہے کیوں کہہ رہا ہے اور کس لیے کہا جا رہا ہے۔

اور اب مدتوں بعد یہ خوش لباس خوش گفتار خوش ذوق کزن نہ جانے کن کن مجبوریوں کو دامن دل میں سمیٹے کس کس پل صراط سے گزر کر میرے سامنے بیٹھا تھا۔

میری پلکوں نے پتھر کی سل بن کر میری نظروں کو چھپا لیا۔ سینے میں دل نے محو رقص ہو کر اضطراب برپا کر دیا اور نرم و نازک ہونٹ میری زبان کے دربان بن گئے۔

کچھ دیر کے سکوت کے بعد اس نے کہا:

نعیم میں اتنی دور سے صرف تمہیں ملنے آیا ہوں نظریں اٹھا کر مجھے ایک نظر دیکھو تو سہی......

یہ لب کھولو!

کچھ تو بولو!

میں نے کالج میں تمہارے بینرز لگے دیکھے ہیں الیکشن لڑ رہی ہو کیا؟

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

تو اس نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا

ان پر لکھا ہوا تھا ڈبیٹر

میں فقط مسکرا دی

اس کا حوصلہ بڑھا......اس نے مدعا بیان کیا......

میں اور میرا خاندان جو ظاہر ہے تمھارا بھی ہے ہم سب تمھاری امی کے سامنے بے بس ہو گئے ہیں۔ نہ جانے انھیں میرے ساتھ اللہ واسطے کا بَیر کیوں ہے۔ اب صرف ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے۔ اس طریقے کے لیے پورا خاندان میرے ساتھ ہے۔

میری بات غور سے سنو

میں تمھاری وارڈن سے اجازت لے لیتا ہوں

بس کچھ دیر کے لیے عدالت تک میرے ساتھ چلی جاؤ۔ تمہیں کچھ نہیں کرنا بس چند کاغذات پر دستخط کرنے ہوں گے۔ باقی سب میں سنبھال لوں گا۔

میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے ایسی بات کرے گا۔

کچھ دیر گہری خاموشی کے بعد اس نے کہا:

تسلی سے سوچ لو۔

ماحول کی خاموشی سے دم گھٹنے لگا تو اس نے جیب سے کاغذ اور پین نکالا......

اور کہا میری بات کا جواب بول کر نہیں دے سکتی تو لکھ کر دے دو۔

میں پھر آ جاؤں گا۔

مگر آس تو دلاؤ

امید تو جگاؤ

اس نے مجھے مائل اور گھائل تو کر لیا مگر قائل نہ کر سکا۔

اس کی ساری دلیلیں باری باری اس وقت دم توڑ گئیں

جب میں نے اپنی پوری ہمت کو جمع کر کے رندھی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا:

''ایسا ممکن نہیں''۔

اس کا چہرہ غصے سے سرخ اور آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ ایک دم کھڑا ہو کر اس نے کہا میں جا رہا ہوں۔

مگر یاد رکھنا

تم ہمارے خاندان کی واحد انٹیلیکچول لڑکی ہو۔۔۔۔ تمھاری ماں نے تمھاری شادی نہیں کرنی اور پھوپھیوں کی طرح تمہیں ضائع کر دیں گی۔

اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا جس میں غصہ بھی تھا التجا بھی تھی اور روک لیے جانے کا انتظار بھی تھا۔

نہ جانے کس آس پراس نے کاغذ پر اپنا فون نمبر لکھا اور......

وہ چلا گیا

اس کا ہر قدم رک رک کر مجھے پکارتا رہا میرے دل نے چیخ چیخ کر شور برپا کر دیا اتنا شور کہ اس سے میرے کان پھٹنے لگے۔

دل کہتا رہا پاگل لڑکی جانے والے پھر نہیں آیا کرتے اسے واپس بلا لے۔

اس کی واپسی کا ہر قدم میرے دل پر ہتھوڑے برساتا ہوا اسلامیہ کالج کے آہنی گیٹ سے مجھے آخری دفعہ شکستہ نظروں سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔

اور یوں میرے دل کے نہاں خانوں میں منہ چھپا کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔

میں واپس ہوسٹل آئی تو بخار سے تپ رہی تھی۔ میں چاہتے ہوئے بھی اپنے اردگرد بنی مجبوریوں کی دیوار نہ توڑ سکی اور بری طرح ہار گئی۔

کمرے میں آ کر میں نے چادر لپیٹی اور اپنے بستر میں منہ چھپا کر دیر تک سسکیاں لے کر روتی رہی۔ جب میرے خون کا ہر قطرہ میرے دل کی ہر دھڑکن آنسو بن کر میری آنکھوں سے بہہ گئے تو میں اپنی ساری شوخی ساری شرارت سارا حوصلہ ساری ہمت ساری بہادری کھو چکی تھی۔ حتیٰ کہ میری جاندار مسکراہٹ بھی کہیں گم ہو گئی جس کی سب دوستیں تعریف کیا کرتی تھیں۔

کالج میں الیکشن کی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ سب نے ہی مجھے کہا نعیم تمہیں اچانک کیا ہو گیا ہے تم اس طرح سے کیوں ہو گئی ہو...... تم فکر کیوں کرتی ہو ہم جیت جائیں گے۔" مگر ان میں سے کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ" جیتی ہوئی بازی ہارنے والے کبھی دوبارہ نہیں جیت سکتے۔ وقت بڑے بڑے زخموں کو سی دیتا ہے الیکشن کی گہما گہمی میں مصروف ہو کر میرا زخم بھی مندمل ہونے لگا اور پھر ہمارا پورا پینل بھاری اکثریت سے جیت گیا۔

پرنسپل کو ہماری کامیابی ایک آنکھ نہ بھائی اور وہ ہمارے مقابل الیکشن ہارنے والی دو چار اپنی پسندیدہ لڑکیوں ہی کو اہمیت دیتی رہیں۔

اس زمانے میں ایگریکلچر یونیورسٹی کا پریزیڈنٹ ادریس باجوہ تھا۔ ایگریکلچرل یونیورسٹی برادری سسٹم کی وجہ سے لڑائیوں کا اکھاڑا بنی ہوئی تھی۔ انھوں نے سوچا کہ فیصل آباد کے تمام تعلیمی

اداروں کی ایک مشترکہ یونین ہونی چاہیے جن میں لڑکیوں کے کالجز سے بھی نمائندگی ہونی چاہیے۔

ہم سے رجوع کیا گیا تو ہم نے بخوشی قبول کر لیا۔ پہلی میٹنگ ایگریکلچرل یونیورسٹی میں ہوئی۔ وارڈن نے مجھے اس میں شمولیت کی اجازت دے دی۔ وہاں الیکشن ہوئے اور مجھے فیصل آباد کی مشترکہ یونین کی وائس پریزیڈنٹ چن لیا گیا۔ رابطے بڑھے تعلقات بڑھے سوشلائزیشن بڑھی۔ اور یوں ہمارے حوصلے بھی بڑھتے چلے گئے۔

انھی دنوں فیصل آباد میں بھٹو صاحب آ رہے تھے اور انھوں نے خصوصی طور پر کالجز کی سٹوڈنٹ یونین سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔۔ چنانچہ ہر کالج میں نمائندہ بھیجنے کے لیے دعوت نامہ آیا۔ ہمیں مشترکہ یونین والوں نے رابطہ کیا اور کہا کہ الگ الگ تو ہم ملیں گے ہی مشترکہ یونین کے حوالے سے بھی ہم بھٹو صاحب سے الگ میٹنگ کریں گے۔ وہیں سے ہمیں پتہ چلا کہ ہمارے کالج سے تو شگفتہ کی بجائے فوزیہ کو بھیجا جا رہا ہے اور پرنسپل نے تو ہمیں اس خط کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ ہم غصے سے بپھر گئیں اور اس دن سے ہماری پرنسپل کے ساتھ کھلی جنگ شروع ہو گئی۔

جھگڑے کا اختتام

بھنور سے لڑو تند لہروں سے الجھو
کہاں تک چلو گے کنارے کنارے
(رضا ہمدانی)

ہماری پرنسپل ہمیں بہلا پھسلا کر رام کر لیتی تو شاید ہم بھی رام ہو جاتیں جوان خون کو گرمانا اور پھر گرماتے رہنا ان کے لیے بھی سازگار نہ ہو سکا۔

اختلافات کے بہت سے موضوعات نے سر اٹھانا شروع کر دیا اور ہم نے بھی پرنسپل کے ساتھ کھلی جنگ شروع کر دی۔ ایک دن ہم نے کالج ٹائم پر کمشنر کو فون کیا اور پرنسپل کی ڈھیر ساری شکایات لے کر پہنچ گئیں۔ کمشنر نے ہماری بات غور سے سنی اور ہمیں تسلی دی کہ ہم اپنے دفتر میں پرنسپل کو بلائیں گے اور اِن سے پوچھیں گے۔ کچھ پولیٹیکل لیڈرز سے بھی ملیں ان ملاقات کا اہتمام مشترکہ یونین نے ہی ہمیں کر کے دیا۔

کمشنر آفس سے پرنسپل کو کال آئی کہ اپنا ریکارڈ لے کر دفتر پہنچو، وہ تو حیران رہ گئیں۔

وہاں سے واپس آئیں تو ان کا غصے سے بُرا حال تھا۔ انھوں نے سب سے پہلے تو وارڈن سے کہا نعیم کو ہوسٹل سے باہر نہ نکلنے دیا جائے اور چوکیدار کو بھی ہدایت کی کہ یہ کسی کام سے باہر نہیں جا سکتی دوسرا کام یہ کیا کہ نوٹس بورڈ پر نوٹس چسپاں کر کے اسے تالا لگا دیا گیا۔

جس میں لکھا گیا ''بوجہ بدتمیزی گستاخی اور اصولوں کی خلاف ورزی مندرجہ ذیل لڑکیوں کو کالج سے نکال دیا گیا ہے اور اب یہ لڑکیاں اس کالج کی طالبات نہیں رہیں۔

یہ نوٹس چھٹی کے وقت لگایا گیا اور کسی کی نظر سے نہ گزرا۔ دوسرے دن میں ابھی ہوسٹل میں

ہی تھی کہ کچھ لڑکیاں بھاگی بھاگی آئیں اور ہمیں یہ خبر سنائی۔ ساتھ ہی شگفتہ بھی کانپتی کانپتی آ گئی......اس نے کہا اب کیا ہوگا؟ میں نے کہا میرے ساتھ چلو۔

پرنسپل کی ناانصافیوں کی وجہ سے ہم پرنسپل کے خلاف رائے عامہ کو کافی حد تک ہموار کر چکے تھے۔ لہٰذا لڑکیوں کی اکثریت ہمارے ساتھ تھی۔

میں نوٹس بورڈ کے پاس گئی جھٹکے سے تالا توڑا نوٹس نکالا اور پرزہ پرزہ کر کے گراؤنڈ میں پھینک دیا۔ لڑکیوں کا ہجوم اکٹھا ہوگیا اور یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے کالج میں پھیل گئی۔ میں نے کہا میں اب کلاس میں جارہی ہوں اور دیکھتی ہوں کون مائی کا لال مجھے کالج سے نکالتا ہے۔

کالج میں اس طرح کے حالات کبھی نہیں ہوئے تھے پرنسپل بادشاہ تھی اور جو چاہتی تھی کرتی تھی۔ ہم نے ایک اور کام یہ کیا کہ اپنی مشترکہ یونین کو بھی خبر کردی، انھوں نے ہنگامی میٹنگ بلائی اور سب مل کر پرنسپل کے آفس آ گئے اور انھیں صاف صاف کہہ دیا کہ نعیم کو آپ نہ تو فیصل آباد کی مشترکہ یونین کی میٹنگ سے روک سکتی ہیں اور نہ ہی کالج سے نکالنے کی جرات کرسکتی ہیں۔ ابھی تک تو ایوان بالا تک ہی بات پہنچی ہے کل کو تمام اخباروں میں بھی خبر چھپ جائے گی۔

پرنسپل بظاہر تو خاموش ہوگئیں۔ ان کی کالج میں اور کالج سے باہر کافی سبکی ہوچکی تھی۔ شہر کی ہر اہم میٹنگ میں یہ ذکر ضرور ہوتا کہ اسلامیہ کالج کی پرنسپل کا اپنی یونین سے کیا جھگڑا ہے۔ وقت انھی لڑائی جھگڑوں میں گزرتا رہا۔ ایک دن مجھے اور شگفتہ کو پرنسپل کے آفس سے بلاوہ آیا۔

ہماری کلاس ہورہی تھی ہم کلاس چھوڑ کر پرنسپل کے آفس پہنچیں۔

تو کوئی آرمی آفیسرز آفس میں بیٹھے تھے بعد میں پتہ چلا کہ یہ پرنسپل کے رشتے دار تھے اور پرنسپل نے انھیں مدد کے لیے بلایا تھا۔

انھوں نے ہمیں آفس میں بٹھایا اور سب سے پہلے تو ہمارا انٹرویو لیا۔ ہمارے والدین کا پوچھا پھر انھوں نے کہا آپ کو پرنسپل سے کیا شکایات ہیں۔

ایک تو وردی کا رعب دوسرا لب ولہجہ بھی شان وشوکت والا مگر ہم بھی کافی بہادر ہوچکی تھیں ہم نے کھری کھری سنادیں۔

پھر انھوں نے پرنسپل سے پوچھا تو انھوں نے روہانسی آواز کے ساتھ بتایا کہ ان گستاخ لڑکیوں نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا میرا وزن آدھا رہ گیا ہے اور ہمیں دھمکیاں دیتے ہوئے یہ بھی

کہا کہ دیکھیے گا ان گستاخ لڑکیوں کا کبھی کہیں رشتہ نہیں ہوگا اور انھیں کوئی قبول نہیں کرے گا۔

مجھے یاد آتا ہے کہ ان میں سے ایک بریگیڈیئر صاحب تھے۔

انھوں نے سب کی باتیں تحمل سے سنیں اور ہم سے مخاطب ہو کر کہا:

پرنسپل آپ کی استاد ہیں اور استاد کی ہمارے اسلام میں بہت عزت ہوتی ہے۔ آپ ایک معافی نامہ لکھیں اور بات کو رفع دفع کر دیں وگرنہ ہمیں آپ کے والدین کو بلانا پڑے گا اور ان سے بات کرنی پڑے گی کمرے سے باہر جا کر کچھ دیر سوچ لو ہم آج یہ فیصلہ کر کے جائیں گے۔

باہر نکلے تو میں نے شگفتہ سے کہا تمھارے والدین تو تمھارے ساتھ ہیں لڑ بھی لیں گے میرے والد کو بلایا گیا تو وہ میرا بوریا بستر اٹھا کر لے جائیں گے میری بی اے کی ڈگری بیچ میں ہی رہ جائے گی۔ کیونکہ میرے والدین کو تو معلوم بھی نہیں کہ میں یہاں کیا کیا کارنامے کرتی پھر رہی ہوں۔ انھیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں نے الیکشن لڑا ہے۔ لہٰذا عافیت اسی میں ہے کہ معافی مانگ لی جائے۔ شگفتہ کی ساری شگفتگی میری وجہ سے ہی تھی وگرنہ وہ تو بہت ہی پیاری اور صلح جو قسم کی لڑکی تھی۔ ہمیں سوچنے کے لیے زیادہ وقت نہیں دیا گیا تھا اور بڑے ہی منظم اور نفسیاتی طریقے سے قابو کیا گیا اور ویسے بھی ابھی تک کسی معاملے میں میرے والد کا نام نہیں آیا تھا۔ نہ ہی میرے وہم و گمان میں تھا کہ یہ بات میرے والد تک بھی پہنچ سکتی ہے۔

ہمیں ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ہمیں دوبارہ بلا لیا گیا۔ میں نے ہی بات شروع کی اور کہا ٹھیک ہے اگر پرنسپل صاحبہ ہمیں دل سے معاف کر دیں تو ہم بھی دل سے بھلا کر معافی نامے پر دستخط کر دیں گی۔ معافی نامہ تیار کروا لیا گیا تھا ہمارے دستخط ہوئے اور یوں لڑائی جھگڑے کا یہ دور ختم ہوا۔

اس کے بعد مجھے "بیسٹ گرل ان دا ہوسٹل" کی ٹرافی ملی۔ شگفتہ کو "بیسٹ گرل ان دا کالج" کی اور مجھے دوسری ٹرافی بیسٹ ہیلپ فل گرل ان دا کالج کی بھی ملی۔ اور یہ ٹرافیاں ہمیں ایگریکلچرل یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر امیر محمد نے دیں جو بعد میں میرے شوہر کے باس بھی رہے۔ پرنسپل کی بڑائی تھی کہ انھوں نے ہمیں کیریکٹر سرٹیفکیٹ بھی صاف ستھرا دے دیا۔ کالج اور ہوسٹل کا یہ دور ختم ہوا اور میرے گھر والوں کو میری ان تمام سرگرمیوں کی بھنک تک نہ ہوئی۔ میں جس آبرو سے گئی تھی اسی آبرو کے ساتھ واپس آ گئی......

بی اے کے بعد یونیورسٹی جانے کی کہانی

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ
(مجروح سلطان پوری)

جب میں بی اے کرنے کے بعد گھر واپس آئی تو میرے والدرڑالہ بنگلہ میں تعینات تھے۔ کالج کی بھرپور زندگی کے بعد بنگلے کا سیدھا سادہ سا ماحول بہت اچھا لگا۔ بھینسوں کا خالص دودھ...... بڑے بڑے درخت آرگینک فروٹ اور سبزیاں مکھن اور بالٹیاں بھر بھر خالص شہد۔ آئے دن گردو پیش کہیں نہ کہیں مکھیوں کے چھتے کی معلومات ملتیں اور میرے والد فوراً بندے بھیج کر شہد نکلوا لیتے بالٹی میں شہد کے علاوہ چھتے کا بھی کچھ حصہ ہوتا امی اسے صاف کر کے بوتلیں بھر بھر کر رشتے داروں اور دوستوں میں بانٹا کرتی تھیں۔

کینوؤں اور آموں کی بوریاں آیا کرتی تھیں۔ امی کو کھانا پکانے کا بہت شوق تھا۔ لہٰذا حلوائی کو گھر بلا کر جلیبیاں بھی بنواتی تھیں۔ کچی ہلدی کی مٹھائی...... دال کا حلوہ۔ کدو کا حلوہ۔ بیسن کا حلوہ اور السی کی پنیاں یہ چیزیں گھر میں اکثر بنتی رہتی تھیں شوگر بلڈ پریشر کا تو معلوم ہی نہیں تھا۔

میرا معمول پھر سے وہی تھا کتابیں پڑھنا خط لکھنا اور صحن میں برگد کے درخت پر پڑا جھولا جھولنا۔

ایک دن میں یونہی باہر گھومنے کے لیے نکلی تو گھر کے پچھلی طرف محکمہ انہار کے کچھ کوارٹروں میں جو لوگ رہتے تھے ان کی باتیں میری سماعت کا حصہ بننے لگیں۔ دو میاں بیوی باتیں کر رہے

تھے شوہر بیوی کو بتا رہا تھا تمھیں معلوم ہے کہ ملک صاحب کی بیٹی بہت پڑھی لکھی ہے بیوی نے پوچھا کتنی جماعتیں پاس ہوگی......

شوہر نے کہا:

میں نے پوچھا تو کبھی نہیں لیکن میرا اندازہ ہے سترہ اٹھارہ جماعتیں تو ضرور پڑھ لی ہوں گی۔

لوگ سادہ ماحول سادہ گھر سادہ اور گھر والے سادہ......مگر سادگی میں بھی پرکاری نہ ہو تو کچھ عرصے بعد ارتعاش پیدا کرنا پڑتا ہے بھلے پتھر ہی کیوں نہ پھینکنے پڑیں۔

انہی دنوں میرے گھر میرے ددھیال والے رہنے کے لیے آ گئے۔میری تائی جان بہت ہی نفیس خاتون تھیں باوقار سمجھدار سلیقہ شعار اور خوش گفتار......

تقریباً پندرہ دن ہو گئے انھیں رہتے ہوئے تو ایک دن مجھے تائی جان نے بلا کر کہا......جانتی ہو ہم لوگ کیوں آئے ہیں اور ہمیں کس نے مجبور کر کے بھیجا ہے......میں نے سر جھکا لیا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد تائی جان کہنے لگیں کئی دنوں سے تمہید باندھنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر جرات نہیں ہو رہی کہ تمھاری ماں سے کس طرح بات کریں۔

اگر نہ بات کی تو منتظر نگاہوں سے کیا کہیں گے۔

بہر حال ایک دن تائی جان نے بڑی ہی ہمت کر کے امی کے سامنے اپنا مدعا بیان کیا۔امی کا ایک دم موڈ بدل گیا اور اس کے ساتھ ہی ماحول بھی بدل گیا۔بس پھر کیا تھا سب نے بوریا بستر سمیٹا اور رخت سفر باندھ لیا۔

میں اب کچھ زیادہ غصیلی اور چڑچڑی سی ہو گئی تھی۔ میں گھر سے باہر بہت دلیر سمجھی جاتی تھی مگر امی کے سامنے کبھی بات کرنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔انھوں نے عزت آبرو شرافت خاندانی جاہ و جلال اور اپنی سمجھ اور عقل کے مطابق اچھے اور برے پیمانوں کی ایسی ایسی کہانیاں میرے خون میں گوندھ دی تھیں کہ میں لاکھ چاہ کر بھی بغاوت نہیں کر سکتی تھی۔

فلاں خاندان کی لڑکی نے بغاوت کر کے شادی کر لی تھی خاندان والوں نے اسے مار کر پھینک دیا۔فلاں نے ایسا کام کیا تو ماں باپ نے زندگی بھر منہ نہیں لگایا۔فلاں زندگی بھر کنواری بیٹھی رہی مگر مجال ہے جو عزت پر حرف آنے دیا ہو مجال نہیں کسی کی کہ ان کی طرف کوئی انگلی اٹھا سکے۔اب ایسی

کہانیوں کو سننے اور سمجھنے کے بعد کس کی مجال ہو سکتی تھی کہ وہ کسی قسم کی کوئی حماقت کر سکے۔
میرے سامنے تو میدان صاف تھا۔ مگر بغاوت کی ہمت نہ تھی ساحر لدھیانوی کا شعر یاد آ رہا ہے۔

میں سمجھتا ہوں تمدن کو تقدس کا فریب
تم رسومات کو ایمان بناتی کیوں ہو
تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کرلو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

اور پھر یونہی زندگی کی گاڑی چلتی رہی...... فراغت کی فراوانی سے میں تنگ آ گئی تھی اور اب کسی چیز میں دل نہیں لگتا تھا۔

ایم اے کے لیے داخلے ہو رہے تھے انہی دنوں میرے منجھلے تایا آئے اور انھوں نے بتایا کہ میرے اس کزن کا نکاح ہو گیا ہے۔

اس کی خالہ کافی عرصے سے چاہ رہی تھی مگر یہ انھیں ٹالتا رہتا تھا۔ اب اس کے مان جانے پر فوراً ہی نکاح ہو گیا۔

انھوں نے بہت سی باتیں بتائیں جو میرے اوپر سے گزر گئیں۔ نہ جانے کیوں مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ زندگی میں کوئی بہت ہی قیمتی چیز چھن گئی ہے اتنی قیمتی کہ جس کا کوئی مداوا نہیں۔ کوئی مول نہیں...... کوئی بدل نہیں۔

میں اس رات بھی تاروں بھرے آسمان کے نیچے خاموشی کی چادر اوڑھ کر بہت روئی تھی۔

''میری امی بہت مطمئن تھی ان کا خیال تھا'' خس کم جہاں پاک......

یونیورسٹی میں داخلے کی بات چلی تو امی سے کسی نے کہہ دیا وہاں تو لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے ہیں۔ پھر مخالفت کا ایک شور اٹھا مگر اب میرا لہجہ بیچارگی والا نہ تھا۔ کیونکہ میرے نمبر بھائی سے زیادہ تھے میں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر مجھے یونیورسٹی میں داخلہ نہ دلوایا تو بھائی بھی نہیں جائے گا کیونکہ یہ سراسر ناانصافی ہے اور میں اپنے ساتھ یہ ناانصافی کسی بھی قیمت پر نہیں ہونے دوں گی۔

میرا بھائی تو فوراً ہی فزکس ڈیپارٹمنٹ میں اپنے کاغذات جمع کروا آیا تھا۔ میرے لیے ابھی

گھر میں صلاح مشورے ہی ہو رہے تھے۔ داخلوں کا وقت تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ میں بہت غمزدہ اور پریشان رہنے لگی تھی۔ ایک دن نہ جانے میرے والد کے ذہن میں کیا آیا بھائی کو بلایا اور کہا جاؤ اور نعیم کے داخلے کے بھی کاغذات جمع کروا دو۔ اس نے کہا اب تو داخلے کا وقت ختم ہو چکا ہے۔

بہر حال وہ میرے کاغذات سمیٹ کر جانے کے لیے تیار ہو گیا تو اس نے پوچھا ابو کس سبجیکٹ میں جمع کرواؤں۔

ابو نے کہا جہاں بھی ہو جائے کروا دینا۔

بھائی یونیورسٹی گیا تو صرف اردو ڈیپارٹمنٹ میں ہی داخلے کا آخری دن اور آخری کچھ گھنٹے تھے وہ کاغذات جمع کروا کے آ گیا۔ اور میرا پنجاب یونیورسٹی میں اورئینٹل کالج کے اردو ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی کے ہوسٹل نمبر تین مریم ہال میں بھی بکنگ ہو گئی۔

میں بہت خوش تھی اگلے دو سال تک آزادی۔ زندگی میں نیا پن۔ اسرار و رموز کی نقاب کشائی۔ تحیر نئی نئی دوستیاں مخلوط تعلیم کا تجربہ اور اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کا زمانہ جو تھا۔

میں نے اپنی تعلیم کا تمام زمانہ اسی طرح گزارا جیسے ٹرین میں بیٹھا مسافر زندگی کی حیرتوں کو تیز تیز بھاگتا ہوا دیکھتا ہے اور خواب آور سی اس کیفیت کو ذہن میں سمو لینے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ نہ جانے پھر یہ سماں آئے یا نہ آئے۔

میرے لیے تو زندگی سمندر میں تیرتی ہوئی کشتی کی مانند تھی
آگے امید پیچھے یادیں نیچے گہرائی اوپر اونچائی

اور کوئی بھی منظر دسترس میں نہیں نہ کشتی میں بیٹھنا نہ کشتی سے اترنا نہ امید کی تتلیوں کو پکڑنا نہ ماضی کے جگنوؤں کو مٹھی میں بند کر لینا بہر حال ہم دونوں بہن بھائیوں نے زادِ راہ کی گٹھڑیاں اٹھائیں اور نئے زمانے کو کھوجنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ہوسٹل پہنچی تو کلرک کے کمرے میں اپنے لیے مختص کمرے کی بابت معلوم کرنے گئی تو وہاں چار پانچ لڑکیاں اور بھی کھڑی تھیں۔

پنجاب یونیورسٹی کے ہوسٹل میں پہلے سال دو لڑکیوں کو ایک کمرہ ملتا تھا۔ لہٰذا کلرک کسی خاص ترتیب سے دو دو لڑکیوں کو ایک ایک کمرہ الاٹ کر رہا تھا۔

مجھے اس نے نگہت ڈار کے ساتھ کمرہ الاٹ کر دیا۔اور میں کمرے کی چابی لے کر کمرے میں سامان رکھنے کے لیے چل دی۔

مجھے بہت زیادہ فکر نہ تھی کہ کس کے ساتھ کمرہ ملے مگر باقی لڑکیاں بہت پریشان تھیں۔نگہت ڈار اسلامیات میں ایم اے کرنے کے لیے آئی تھیں اور اس نے گوجرانوالہ ڈویژن میں ٹاپ کیا تھا۔ بہت ذہین اور پڑھاکو قسم کی لڑکی تھی جس نے بعد میں پی ایچ ڈی بھی کی اور درس وتدریس سے وابستہ رہی......

کمرے تک پہنچتے پہنچتے ہم کافی بے تکلف ہو چلی تھیں۔نگہت نے مجھے بتایا کہ تم جب کمرے میں داخل ہوئی تھی تو تم نے تو مجھے نہیں دیکھا مگر میں نے دعائیں مانگنی شروع کر دی تھیں کہ یااللہ مجھے اس لڑکی کا ساتھ دے دے۔ اتنے میں کلرک نے ہم دونوں کو ایک کمرہ الاٹ کر دیا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا اب میں شکرانے کے نفل ادا کروں گی۔ ہماری ہی لائن میں فرحت ہاشمی کا کمرہ بھی تھا۔فرحت ہاشمی بھی بہت خوش تھی کہ میں ایک لمبا سفر طے کر کے یونیورسٹی تک پہنچ گئی ہوں۔ وہ میرے حالات سے بہت اچھی طرح باخبر تھی۔ میں اور نگہت کمرے میں آئیں تو کمرہ دیکھ کر حیران رہ گئیں اس کمرے میں ہم سے پہلے کوئی فائن آرٹ کی لڑکی رہ کر گئی تھی جس نے کمرے کی دیواروں پر بہت ہی خوبصورت پینٹنگ کی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں ہی دیکھ کر خوش ہوگئیں۔ اگلے دو سال جو بھی ہمارے کمرے میں مہمان آتا جب تک کہ اسے معلوم نہ ہوجاتا ہمارے اس فن سے خوب متاثر ہوتا۔

میری اور نگہت کی عادتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا وہ سخت پردہ دار کٹر مذہبی تنہائی پسند اور پڑھاکو قسم کی......اور میں شرارتی ملے گلے والی مجلسی طبیعت......

بعد میں اکثر میں اس سے پوچھا کرتی تھی کہ آخر تم نے مجھ میں کیا دیکھا تھا کہ میرے ساتھ رہنے کے لیے دعاؤں پر اتر آئی تھی اور وہ مذاق میں کہا کرتی تھی......بس غلطی ہوگئی۔ ہماری متضاد طبیعتوں کے باوجود بہت دوستی تھی۔ میں نے ہمیشہ اپنی تمام سرگرمیاں کمرے سے باہر رکھیں اور یونیورسٹی میں مشہور کر رکھا تھا کہ مجھ سے ملنے کے لیے کوئی کمرے میں نہ آئے۔ میں نے کبھی اسے ڈسٹرب نہیں کیا تھا اگر میں بے وقت کمرے میں آتی تو دبے پاؤں آتی تا کہ نگہت ڈسٹرب نہ ہو۔

اس کے سونے جاگنے کے ساتھ ہی اپنے شب وروز کو ترتیب دیا کرتی۔

وہ اکثر میری سرزنش کرتی مانا تم ذہین ہو کبھی پڑھائی کی طرف بھی آجایا کرو۔ میرا فرحت ہاشمی اور دو اور لڑکیوں کا ایک گروپ بن گیا تھا۔ فرحت ہاشمی بھی سخت پردہ کرتی تھیں۔ میں ان پردہ دار خواتین کی بہت گہری دوست تھی مگر ان کی لاکھ تبلیغ کے باوجود پردے کی طرف نہیں آتی تھی۔ ہماری خوب علمی بحثیں ہوتیں۔ فرحت میں کچھ شرارتی عنصر بھی ہوتا تھا نگہت مزاح کو سمجھتی تھی مگر بہت سنجیدہ تھی۔

شام کا وقت تھا میں اور نگہت ابھی باتیں ہی کر رہی تھیں کہ مجھے جمعیت کی طرف سے کسی میٹنگ کا بلاوہ آ گیا۔ میں بہت حیران ہوئی کہ ابھی تو مجھے چند گھنٹے ہوئے ہیں ہوسٹل میں آئے ہوئے۔ تو یہ کہاں سے اور کیسے بلاوہ آ گیا۔

خیر مطلوبہ جگہ پر پہنچی تو پتہ چلا کہ جمعیت کو میری کالج کی تمام سرگرمیوں کی خبر تھی اور انھوں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ یہ پی ایس ایف کے ہتھے چڑھ جائے اسے قابو کر لو۔

مجھے تو فیصلہ کرنے کی مہلت ہی نہ ملی اور میں جمعیت کی عہدیدار بھی ہو گئی۔

نگہت ڈار اور فرحت ہاشمی نے پوچھا کیا ہوا۔ فرحت کو تو معلوم ہی تھا البتہ نگہت ڈار کو سن کر بہت حیرت ہوئی۔

اس نے حیران ہو کر پوچھا کیا تمھارا کالج یونین سے بھی کوئی تعلق تھا؟

میرا اثبات میں جواب سن کر اس نے ہنستے ہوئے کہا اچھا اس کا مطلب ہے سیاست کے جراثیم بھی ہیں......

اوہ پھر تو مجھے واقعی اپنی دعا پر پشیمانی ہے۔

مجھے نگہت ڈار کے ساتھ رہنے میں کئی قسم کے فوائد ہوئے۔ میں اپنی علمی پیاس بجھا لیتی۔ ذوقِ مطالعہ کے لیے وقت نکال لیا کرتی اور کسی وقت اپنی ڈگری کے لیے پڑھ بھی لیا کرتی تھی۔ دینی رجحان کی بھی رہنمائی اور تسکین ہو جاتی۔ نگہت ڈار کے ڈر سے کوئی دوست میرے کمرے میں نہ آتی۔ بس باہر سے بلا لیتیں اور نگہت مسکرا کر مجھے کہتی...... ہوں مٹر گشت......کبھی پڑھ بھی لیا کرو جس مقصد کے لیے یہاں آئی ہو۔

اور میں جوابی مسکراہٹ اس کی طرف پھینکتے ہوئے کمرے سے نکل جاتی۔

فرحت ہاشمی کے ساتھ تو میں اور طرح کے مزے کرتی کبھی ہم مولانا مودودی کے گھر اچھرہ درس سننے کے لیے جاتیں اور کبھی اہلِ تشیع کی محفلوں میں جا کر ان کی باتیں سنتیں اور پھر ہم مل کر ان پر مکالمہ کیا کرتیں اور کچھ ابہام ہوتا تو ریفرنس بک ڈھونڈ کر کھوج لگاتیں۔ میں ہوسٹل میں داخل ہوتے ہی اس ماحول میں رچ بس گئی تھی۔ اس کے علاوہ جمعیت میں بھی متعارف ہو چکی تھی۔ پنجاب یونیورسٹی کی ساری سیاست ہوسٹل سٹوڈنٹ پر منحصر ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ ہوسٹل کے نمائندگان ہر وقت میسر ہوتے تھے۔

ہوسٹل میں آئے ہوئے ابھی ایک دو دن ہی ہوئے تھے کہ کھانے کے کمرے میں جاتے ہوئے میری ملاقات ایک بہت پیاری موٹی، چھوٹی گھپلوسی لڑکی سے ہوگئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آنکھوں میں اداسی کے گہرے بادل جو اُمڈنے کے لیے کسی بہانے کی تلاش میں تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ہمدرد سمجھ کر میرے پاس آ گئی۔

میں نے پوچھا کہاں سے آئی ہو اور کونسا ڈیپارٹمنٹ ہے؟

کہنے لگی اردو اور سیالکوٹ سے آئی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی وہ چھم چھم رونے لگی۔ میں اسے ایک طرف لے گئی اور کافی دیر تک تسلیاں دیتی رہی مگر وہ بلک بلک کر روتی رہی۔ اس نے بتایا کہ اس نے بی اے میں گولڈ میڈل لیا تھا۔

ابھی دو تین دن ہوئے تھے اسے آئے ہوئے اور وہ واپس جانے کی تیاری کر چکی تھی۔ اس نے اپنے گھر پیغام بھیج دیا تھا کہ میں بہت اداس ہوں اور مجھے آ کر لے جائیں......

مجھے اس لڑکی سے ہمدردی سی ہوگئی اور اپنا کالج کا زمانہ یاد آ گیا۔ میں جب پہلی دفعہ ہوسٹل آئی تھی تو اسی طرح بلک بلک کر روتی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ دیکھو تمھاری ساری قابلیت اور خواب ادھورے رہ جائیں گے۔ کچھ دن صبر کرو دل لگ جائے گا۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے راضی کیا کہ گھر والوں کو فون کرو کہ ابھی نہ آئیں۔ ابھی تک وہ اورینٹل کالج بھی نہیں گئی تھی۔ بہرحال اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ اگر تم میرے ساتھ رہو گی تو میں رہوں گی وگرنہ واپس چلی جاؤں گی۔

خاور بھی روایات میں گندھی مشرقیت میں لپٹی ایسی لڑکی تھی جسے اپنی خاندانی شرافت اور راجپوتانہ جاہ وجلال کا بہت احساس تھا۔ میں ہر وقت اس کے ساتھ رہتی اسے ہنساتی رہتی اور ہر ممکن خوش رکھنے کی کوشش کرتی کچھ ہی دیر بعد اس کا دل لگ گیا اور وہ مطمئن ہوگئی۔

اب میرے ایک طرف فرحت ہاشمی جیسی مضبوط خاتون دوسری طرف نگہت ڈار جیسی قابل ذہین اور الگ تھلگ رہنے والی دوست اور تیسری طرف خاور جیسی بارعب اور قاعدے قانون والی سہیلی اوپر سے جمعیت والوں کا اثر ورسوخ۔

فرحت ہاشمی نے کبھی مجھ پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ البتہ اس کی بہت کوشش تھی کہ میں پردے کی طرف آ جاؤں۔ فرحت نے مجھے کہا یونیورسٹی میں آپا نثار فاطمہ کا درس ہو رہا ہے میں چاہتی ہوں تم میرے ساتھ چلو...... مجھے معلوم تھا کہ احسن اقبال کی والدہ آپا نثار فاطمہ پردے پر ایسا جاندار لیکچر دیتی ہیں کہ اکثر لڑکیاں یا تو پردہ کر لیتی ہیں یا پھر ذہنی خلفشار کا شکار ہو جاتی ہیں۔ میں نے فرحت ہاشمی سے کہا کہ میں پردہ تو ہرگز نہیں کروں گی اور درس میں شریک ہو کر ذہنی مریض بھی نہیں بننا چاہتی سو میں اس درس میں نہیں جاؤں گی۔ اس نے بہت قائل کرنے کی کوشش کی نگہت نے بھی کہا مگر میں نہیں گئی۔

خاور بھی نئے نئے تجربات سے گزرنے کی عادی نہیں تھی اور اصول وضوابط کے جو دائرے بنائے ہوئے تھے اس سے ایک قدم بھی ادھر ادھر نہیں ہوتی تھی۔

میں نے دھیرے دھیرے اس تکون سے نکلنے کی کوشش کی۔ اس وقت پنجاب یونیورسٹی میں سمسٹر سسٹم تھا سب مصروف ہوگئے۔ خاور اور میرے درمیان فیصل آباد کی دو بہنیں آصفہ اور رفاقت بھی آ گئیں۔ دوستوں کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ مختلف ڈیپارٹمنٹ میں ہونے کی وجہ سے ہماری مصروفیات بھی مختلف ہوگئیں۔ سب ہی قابل تھیں سب کو ہی اپنی اپنی پڑھائی کی فکر تھی اور سب ہی اپنے اپنے کاموں میں الجھ گئیں۔

میری طبیعت میں اضطراب تھا۔ کسی ایک جگہ رکنا اور کسی ایک چیز پر اکتفا کر کے بیٹھ جانا میری فطرت میں ہی نہ تھا۔

کمرے میں امن وسکون کی وجہ سے میں اپنے نصاب کی ورک گردانی بھی کر لیتی تھی اور دیگر

مصروفیات کے لیے بھی وقت نکال لیتی تھی۔ میری دوستوں کا حلقہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ میرے حوصلے بڑھنے لگے میں کبھی کبھار دوستوں کو منا کر اور بھائی سے اجازت لے کر فلم دیکھنے بھی چلی جاتی۔ جو دوست مخالفت کرتی وہ ہماری شوخیاں اور شرارتیں سن کر اگلی دفعہ ہمارے گروپ کا حصہ بن جاتی۔ فرحت ہاشمی اور نگہت ڈار کی دوستی کا میں نے ایک علیحدہ خانہ بنالیا تھا۔ جس کا اپنا لطف وسرور تھا۔ شرارتی سہیلیوں کا الگ گروپ تھا جس میں ہم اور طرح مزے اڑاتے۔ اس گروپ میں کبھی کبھی میں اپنے بھائی کو بھی جو میرے ساتھ یونیورسٹی میں فزکس ڈیپارٹمنٹ میں تھا شامل کر لیتی۔ کبھی لاہور کے تاریخی مقام کی سیر کے لیے نکل جاتے اور کبھی راوی میں کشتی رانی کرنے کے لیے پروگرام بن جاتا۔ میرا بھائی بھی زیادہ سوشل نہیں تھا اور وہ میری ہی نگہبانی میں لگا رہتا تھا۔ میرے ہوسٹل کے چوکیدار سے دوستی کر لی اور وہ چوکیدار میری پل پل کی خبر پہنچاتا رہتا۔ کہاں گئی، کہاں سے آئی اور کتنے بجے آئی۔ اس کو سب خبر پہنچ جاتی کافی عرصے تک میں مخبر کے بارے میں جان ہی نہ سکی کہ اسے پل پل کی خبر کون دیتا ہے پھر ہم نے کھوج لگانا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو ہمارا چوکیدار عدالت ہے جو سب بتاتا ہے۔ پھر ہم ہر کام اس سے بچ کر کرنے لگے۔

میری دوستوں کے گروپ میں کوئی بھی میرے جیسا نہیں تھا۔ وہ بھی ہمیشہ ڈرانے دھمکانے میں لگی رہتیں۔ میری مجبوری تھی کہ مجھے ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ گھسیٹ کر لے جانا پڑتا تھا کیونکہ بھائی کی کڑی نظر رہتی تھی اور ہوسٹل سے باہر اکیلے جانے کی اجازت نہ تھی۔

بہر حال رفاقت کا بھرپور ساتھ رہا اور خاور بھی چوں چرا کر کے ساتھ چل پڑتی۔

میری دوستیں مجھ سے بہت محبت کرتی اور سمجھانے بجھانے کے بعد میری من مانیوں پر میرے ہر کام میں میری مدد بھی کر دیا کرتی تھیں۔

ان دنوں میری مصروفیات کافی بڑھ گئی تھیں میں اکثر ریڈیو پر افسانہ پڑھنے جاتی۔ مختلف ٹی وی پروگرامز میں شرکت کرتی۔

پنجاب یونیورسٹی کے اخبار ''اخبار جامعہ'' کی سب ایڈیٹر بھی بن گئی تھی۔ جمعیت والے مجھے الیکشن کے لیے بھی تیار کر رہے تھے لہٰذا وہ مصروفیات میٹنگز الگ تھیں۔ میں کبھی کبھار تفریح کے لیے مشاعروں میں بھی حصہ لے لیتی تھی۔

میری شاعری توشغل کے لیے اور مشاعروں میں شریک ہونے کے لیے ہوا کرتی تھی جس کی نوک پلک میرا کلاس فیلو شبیہ الحسن سنوارا کرتا۔

ہم سب دوست اس کو شغلیہ شاعری کہتے اور اپنا مذاق بھی خود اڑایا کرتے تھے۔ شبیہ الحسن اچھا خاصا شاعر اور افسانہ نگار تھا۔ بڑا ہی سنجیدہ بھائی بھائی سا لگا کرتا اس لیے ہمارے گروپ میں شامل ہو گیا تھا۔ وہ اہلِ تشیع تھا اس کے باپ بہت جانے پہچانے مرثیہ خواں شاعر اور اہلِ تشیع کے مشہور عالم تھے۔

ایک دفعہ یونیورسٹی آڈیٹوریم میں سالانہ مشاعرہ ہوا میں نے شبیہ سے کہا کہ میں اس میں شریک ہونا چاہتی ہوں میری غزل کی نوک پلک سنوار دو۔

مشاعرے کے شروع ہونے سے پہلے ہی میں اپنی تمام دوستوں کو لے کر آڈیٹوریم میں پہنچ چکی تھی میرا بھائی فزکس ڈیپارٹمنٹ میں تھا ان کے ڈیپارٹمنٹ میں کوئی لڑکی نہیں تھی لہٰذا فزکس ڈیپارٹمنٹ لڑکیوں پر پھبتیاں کسنے میں مشہور تھا۔

کوئی لڑکی ڈر کے مارے وہاں سے نہیں گزرتی تھی۔ مشاعرے والے دن میرا بھائی بھی ہوٹنگ کرنے کے لیے اپنے دوستوں کے ساتھ اگلی صف میں موجود تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میری بہن بھی اس میں حصہ لے رہی ہے۔

آڈیٹوریم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ابھی مشاعرہ شروع نہیں ہوا تھا کہ ہوٹنگ شروع ہو گئی۔ اتنی ہوٹنگ کہ مجمع سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ بہت بڑے بڑے نامی گرامی شاعر مثلاً امجد اسلام امجد اور شبنم شکیل بھی اس مشاعرے میں تھے۔ پروگرام کی ترتیب کچھ اس طرح کی تھی کہ پہلے اورینٹل کالج کے نو آموز شعرا کو دعوت دی جائے گی پھر آہستہ آہستہ مہمانوں کی طرف آیا جائے گا۔

مگر شرکا کا مزاج دیکھتے ہوئے فیصلہ کیا گیا کہ نو آموز لڑکیوں کو تو بالکل ہی نکال دیا جائے وہ نہیں چل سکیں گی۔ البتہ چند لڑکوں سے مشاعرے کی ابتدا کر لی جائے۔ لسٹ میں تمام متوقع شریک شاعرات کو لسٹ سے نکال دیا گیا۔ ہم سب بھی ہوٹنگ کے لیے گروپ در گروپ شرکا میں بیٹھ گئیں۔

مشاعرہ شروع ہوا اور سب سے پہلے اورینٹل کالج سے جو نام پکارا گیا وہ تھا نعیم علوی ...... میں

کچھ دیر تو ادھر ادھر دیکھتی رہی جب تیسری دفعہ میرا نام پکارا گیا تو میں سامعین سے اٹھ کر اسٹیج پر چلی گئی۔ اعتماد تو کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ شبیہ الحسن نے میری غزل کی نوک پلک اپنے والد سے ٹھیک کروائی تھی وہاں سے بھی پُر اعتماد تھی۔ لہٰذا میں نے مشاعرے میں انتہائی ہوٹنگ میں غزل سنا دی۔

ہوا دراصل یہ کہ میں یونیورسٹی میں نعیم علوی کے نام سے مشہور تھی لہٰذا مغالطے میں لڑکا سمجھ کر میرا نام پکار دیا گیا۔ میرا بھائی جو دوستوں کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر ہوٹنگ کے لیے بیٹھا تھا، اس نے بعد میں بتایا کہ میرا تو ہاتھ وہیں ساکن ہو کر رہ گیا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے اور مجھے نہیں معلوم تم نے کیا کہا......

بس میں تو آیت الکرسی ہی پڑھتا رہا۔ کہنے لگا میرے صرف ایک دوست کو پتہ تھا کہ یہ اس کی بہن ہے وہ چپ رہا، باقیوں نے خوب ہوٹنگ کی مگر میں اس وقت ہوش میں ہی نہیں تھا کہ ان کہ ہوٹنگ اور جملے بازی کو سن سکتا۔ بعد میں کافی دیر لگی مجھے نارمل ہونے میں۔

مشاعرہ تو ختم ہوا یہ بھی غنیمت ہوا کہ میرے بھائی نے میری عشقیہ غزل سنی ہی نہیں۔ خیر سنتا بھی تو کونسا سمجھ میں آنی تھی۔ مشاعرے کے بعد کی داستان بھی دلچسپ ہے۔

میں نے اپنا تخلص ہالہ رکھا تھا چاند کے گردائرے میں ایک پھڑکتی ہوئی رومینٹک غزل...... اورئینٹل کالج اور یونیورسٹی کا زمانہ۔ میں اس مشاعرے کے بعد شاعرہ کے طور پر متعارف ہو چکی تھی۔ رسالوں کے فرنٹ پیج پر میری تصویریں اخباروں میں بھی چھپ گئیں...... یونیورسٹی میں جہاں سے بھی گزرتی فقرے کسے جاتے۔ متوجہ کرنے کے لیے لمبی ہائے اور پھر نعرہ بلند ہوتا...... خالہ خالہ!!!

میں نے تو بہت ہی سوچ سمجھ کر اپنا تخلص تخلیق کیا تھا یہ نہیں جانتی تھی کہ اس میں سے ظرافت کا یہ پہلو بھی نکل سکتا ہے۔ کافی عرصے تک یہ چرچا رہا اور پھر مجھے بڑی ہی چاہت سے مشاعروں میں بلایا جانے لگا۔ ایک دفعہ پرل کوٹینل میں مشاعرہ تھا اور مشاعرے کے منتظمین نے وارڈن سے بھی خصوصی طور پر اجازت لے لی تھی مگر میرے بھائی کو اس کا علم ہوا تو اس نے کہا جو تم نے معرکہ مارنا تھا مار لیا اب خبردار جو کسی مشاعرے میں گئی۔ زیادہ پر پُرزے نکالنے کی کوشش کی تو واپس گھر جانے کی تیاری کر لینا......اور......دریا بہتا رہا مگر میری نام نہاد شغلیہ شاعری کا دور ختم ہو گیا۔

الیکشن کے بعد

دُنیا بھر سے دوستوں پیاروں کے لکھے ہوئے میسجز آڈیو میسجز اور فون کالز سے جس طرح کورونائی '' ماحول میں کھڑکی کے پاس مقید ہو کر مذاق مذاق میں لکھی گئی یادداشتوں کو پزیرائی ملی۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا کہ کسی کو اس کی قابلیت اور اہلیت سے بھی زیادہ عزت کیسے مل سکتی ہے بھلا؟ خدا کی بھی شان نرالی ہے۔

دوسری حیران کن بات کا علم یہ ہوا کہ مجھ جیسے لوگ جنھیں عمر بھر نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا رہی ہو اسے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ پذیرائی اور ستائش میں منوں ٹنوں کے حساب سے طاقت ہوتی ہے جب وہ کسی کو دھکا دیتے ہیں تو مریل گھوڑا بھی سرپٹ دوڑنے لگتا ہے آپ بیتی چل رہی ہے سچ بولنے کی عادت خون بن کر رگوں میں گردش کرتی ہے۔ لہٰذا فی الحال چیدہ چیدہ حصے ہی پیش کروں گی۔

اورینٹل کالج کی یادوں کو سمیٹنا کوئی آسان کام نہیں۔ ہر روز ہی کچھ نہ کچھ نیا ہوتا زندگی میں نئی ہلچل نئی روشنی نئی امیدیں شرارتیں اور نئے واقعات۔ بس انہی حالات میں کبھی کبھی میں پڑھ بھی لیا کرتی تھی......

اسی کالج میں میں نے سیاست کی۔ اسی کالج میں سیاست کے اتار چڑھاؤ بھی دیکھے۔ اسی کالج میں سیاسی جھگڑوں کا بھی مشاہدہ کیا۔ اسی کالج میں آنسو گیس کا ذائقہ بھی چکھا۔ اسی کالج میں ایک دفعہ پی ایس ایف کے ارشد اعوان کو مشین گن کے ساتھ گشت کرتے ہوئے دیکھ کر اتنا تیز بھاگے کہ ہم میں سے اکثر کے جوتے پاؤں سے کھسک گئے اور پھر ننگے پاؤں سڑکوں پر بھاگتے ہوئے پاؤں زخمی بھی ہوئے۔

اورینٹل کالج میں نئے داخلے شروع ہوتے ہی ایک نئی طرح کی گہما گہمی کا آغاز ہوگیا۔ جمعیت والوں نے بھی نئے لوگوں کے استقبال کے لیے سٹال لگایا۔ جس کی ڈیوٹی مجھے سونپی گئی۔ باقی لوگ تو کھلنڈرے ہی تھے شغل میلے میں لگے رہتے۔ میں نے اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے خوب جم کر کام کیا...... کیونکہ مجھے احساس تھا کہ میں کن کن مشکلات کے بعد یہاں تک پہنچی ہوں۔ یونیورسٹی میں داخل ہونے والا ہر نیا طالب علم میرا مداح تھا اور مجھے بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ الیکشن ہوئے تو اورینٹل کالج کے الیکشن میں جمعیت والوں نے صرف لڑکوں کو ہی اہمیت دی...... مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے الیکشن کمپین میں حصہ لینے سے انکار کر دیا......

مزے کی بات یہ ہوئی کہ جمعیت والے جب گروپ کی صورت کمپین کرنے کلاسز میں گئے تو نئے طالب علموں نے ہزار طرح کے سوالات کیے اور کہا کہ ہم تو صرف نعیم علوی کو ہی جانتے ہیں جس نے ہماری بہت مدد کی تھی۔ وہ کہیں گی تو ہم جمعیت کو ووٹ دیں گے وگرنہ ہم آپ لوگوں کو نہیں جانتے۔ ان میں عباس نجمی وغیرہ کا بھی گروپ تھا۔ جب ہر کلاس سے یہی جواب ملا تو یہ لوگ بہت پریشان ہوئے۔

میرے بھائی کو میری پل پل کی مصروفیت کا پتہ تھا اور اس کے مشورے بھی شاملِ حال تھے...... اورینٹل کالج سے دس بارہ جمعیت کے سرکردہ لڑکے مجھے منانے کے لیے ہوسٹل میرے پاس آئے۔ میں ان کے درمیان بیٹھی تھی اور وہ میرے اردگرد...... کہ اچانک میرے تایا جان مجھ سے ملنے کے لیے ہوسٹل کے گیٹ سے داخل ہوئے...... میری تو جان ہی نکل گئی۔ حیران کن بات یہ تھی...... کہ مجھے تقریباً ایک سال ہوگیا تھا یونیورسٹی آئے ہوئے مگر میرے ددھیال میں سے کبھی کوئی یونیورسٹی نہیں آیا تھا۔

ہمارے گھر کا ماحول...... اور پھر میرے یہ تایا جان اتنے رعب دبدبے والے تھے کہ ایک دفعہ شادی سے پہلے میں نے لپ اسٹک لگالی...... تو تایا جان نے مجھے دیکھا اپنے پاس بلایا اور کہا بیٹا تم تو ویسے ہی بہت پیاری ہو یہ فضول فیشن کرنے کی کیا ضرورت ہے...... تمھیں معلوم ہے شریف لڑکیاں اس طرح کے فیشن نہیں کرتیں...... میں اتنا شرمندہ ہوئی کہ رونے لگ گئی اور پھر شادی کے بعد بھی میں جب علوی صاحب کے ساتھ اپنے تایا کے ہاں جاتی تو گھر کے اندر داخل

ہونے سے پہلے ٹشو سے لپ اسٹک صاف کرلیا کرتی تھی۔

علوی صاحب بہت سمجھاتے کہ اب تمھیں کسی کا خوف نہیں ہونا چاہیے۔تم شادی شدہ ہو بااختیار ہو......مگر اختیار آزادی جرات ہمت دلیری اور بہادری کوئی چائے کا کپ نہیں ہوتا کہ اٹھایا اور پی لیا......

اور اس وقت میں لڑکوں کے درمیان بیٹھی تھی اور میرے وہی تایا مجھے دیکھ چکے تھے اور انتہا یہ کہ میں نے بھی انھیں دیکھ لیا تھا۔جونہی تایا نے مجھے لڑکوں کے درمیان دیکھا فوراً پلٹ گئے۔

میں پیچھے بھاگی مگر وہ جا چکے تھے۔میری ہمت اور اعتماد کی کمک لائن ختم ہو چکی تھی۔بہرحال جمعیت کے نمائندہ لڑکوں نے مجھے اورینٹل کالج میں اردو سوسائٹی کی جنرل سیکرٹری اور ہوسٹل کی ہیڈ گرل کی سیٹ پر الیکشن لڑنے کے لیے منالیا۔

دوسری طرف میرے تایا پریشانی کے عالم میں سیدھے میرے بھائی کے پاس گئے اسے ہوسٹل کے کمرے سے باہر بلایا دوستوں سے الگ کرکے ایک طرف لے گئے اور سرگوشی میں آنکھوں دیکھا حال سنایا۔

میرے بھائی نے مجھے بعد میں بتایا کہ میں نے پہلے انھیں پانی کا گلاس پلایا۔ان کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ان سے بات نہیں ہو رہی تھی اور ان کا رنگ اڑا ہوا تھا۔میرے بھائی نے انھیں بڑی ہی مشکل سے سمجھایا اور بتایا کہ نعیم نے لڑکوں سے ملنے کے لیے مجھ سے اجازت لی تھی اور میرے علم میں ہے۔وہ کچھ کچھ قائل تو ہو گئے مگر انھوں نے یہ بات گھر میں کسی کو نہیں بتائی حتیٰ کہ تائی جان کو بھی نہیں بتائی۔کیونکہ وہ خاندان کی نہیں تھی اور اس واقعے سے خاندان کے لیے کوئی بُری رائے قائم کرسکتی تھیں اور میں ڈر کے مارے کئی ہفتے اپنے ددھیال نہ گئی۔

پنجاب یونیورسٹی میں ہوسٹلوں کے الیکشن بہت اہمیت کے حامل ہوتے تھے کیونکہ فیصلہ سازی میں ان کا بہت عمل دخل ہوا کرتا تھا۔

ہوسٹل میں بھی یہ ہوا نئے لوگوں کو خوش آمدید کہنے اور انھیں گوناں گوں مسائل سے نکالنے، ان کی مدد کرنے میں میری خوش اخلاقی خدمتِ خلق اور ہمدردانہ صلاحیت بہت کام آئی......انسان کتنا بھی باصلاحیت ہمدرد اور خدمت گزار کیوں نہ ہو۔جب تک اس کے پاس اچھے اور مخلص

دوستوں کی پوری کھیپ نہ ہو وہ کبھی الیکشن نہیں جیت سکتا......

میری خوش قسمتی یہ تھی کہ پنجاب یونیورسٹی میں ہر چیز ہی مجھے موافق ملی میری دوستیں اتنی ہمدرد اور جان لڑانے والی تھیں کہ مجھے زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑی۔ میری مخالفت میں پی ایس ایف کی لڑکی شاہدہ کیانی بھی میری دوست تھی اور مجھے اکثر کہا کرتی تھی کہ میں نے بھی تمہیں ہی ووٹ دیا تھا۔ وہ بھی بہت اچھی سمجھدار اور پیاری لڑکی تھی۔ میں نے بھی سوچا ہوا تھا کہ میں اسے ہی ووٹ دوں گی میری سہیلیوں کو معلوم ہوا تو انھوں نے کہا ہم مر گئے ہیں تمھاری کنونسنگ کرتے کرتے اگر تم نے شاہدہ کیانی کو ووٹ دیا تو ہم سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔ بہر حال وہ الیکشن تو ہار گئی مگر ہم بعد میں بھی بہت اچھی دوست رہیں۔

ہوسٹل میں الیکشن مہم بڑی ہی دلچسپ ہوتی تھی یوں لگتا تھا کہ عید کا سماں ہو...... گہما گہمی نعرے بازی ڈائننگ ہال مین بھی ہلہ گلہ ٹی وی لاؤنج میں بھی گروپ بندی خون گرم رکھنے کا اک بہانہ......

روز نعرے بازی ہوتی...... نعرے بھی بہت دلچسپ ہوتے تھے۔

"نعیم ساڈھی شیر اے باقی ہیر پھیر اے"

"نعیم ساڈھی جیتے گی...... جیتے گی بھئی جیتے گی"

ذرا اٹھ کے بولو...... جیتے گی

ذرا بیٹھ کے بولو...... جیتے گی

ذرا جھک کے بولو...... جیتے گی

ذرا تن کے بولو...... جیتے گی

اس میں آواز کا اتار چڑھاؤ اور اٹھنا بیٹھنا رنگ جما دیتا تھا۔ ایک لمبی لڑی تھی جو ٹپوں کی طرح گائی جاتی اور لڑکیوں کا والہانہ پن اس میں شریک ہو کر اس محفل کو چار چاند لگا دیتا۔ الیکشن کمپین ایک تہوار کا رنگ اختیار کر لیتی لڑکیوں کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل ہوتا...... یوں لگتا ہر لڑکی ہی لیڈر رہے ہر لڑکی ہی الیکشن لڑ رہی ہے۔ میرے بولنے کی تو باری ہی نہ آتی اور میری مخالفت کا ہر حربہ میری چارہ گر میری خیر خواہ رفاقت آصفہ خاور اور دیگر دوستیں خود ہی نمٹ لیتیں۔

نعروں کا جوش وخروش اور جذبہ بھی دیدنی ہوتا...... اسی ولولے میں لڑکیاں گانوں کی طرز پر بھی نعرے ایجاد کرلیتیں۔ الیکشن مہم میں حصہ لینے کے بعد میرے اخراجات کافی بڑھ گئے تھے کینٹین کا بل ہی کافی بن جاتا...... مجھے اور میرے بھائی کے پاس مخصوص خرچہ ہی ہوتا تھا۔ میرا بھائی نہ تو سوشل تھا اور نہ ہی میری طرح فضول خرچ اس کا جیب خرچ بچ جاتا۔ لہٰذا وہ اپنے حصے کے پیسے بھی مجھے ہی دے دیتا۔ بعد میں زندگی بھر کبھی کسی بات پر بحث ہوجاتی تو مجھے یاد دلاتا یاد کرو وہ وقت جب میں اپنے حصے کا بھی جیب خرچ تمھیں دے دیا کرتا تھا......

میرے گھر والوں کو تو معلوم ہی نہ تھا کہ میں گھر سے باہر کیا کیا معرکے مارتی پھرتی ہوں۔ لہٰذا وہاں سے کمک آنے کی توقع نہیں تھی۔ میرے پاس پیسے ہی نہیں تھے کہ میں اپنے لیے پوسٹر اور بینرز چھپواتی...... سب ہوسٹلوں میں بڑے بڑے بینرز لگ چکے تھے ہمارے سپورٹرز کے لیے بڑی شرمندگی کا باعث تھا کہ ہمارے ہوسٹل میں پوسٹروں والی گہما گہمی نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاہدہ کیانی کے بینرز لگنے سے میرے ووٹرز میں تو اور بھی بے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

میرے پاس رقم کے حصول کا کوئی ذریعہ نہیں تھا ایک وقت آیا میں نے سوچا بھاڑ میں جائیں الیکشن زیادہ سے زیادہ ہار جاؤں گی اب میں بنک لوٹنے سے تو رہی......

یونیورسٹی میں میری ایک کزن فرحت اعوان بھی تھی جو میری ہم عمر بچپن کی ساتھی اور اس کے علاوہ بہت پیاری دوست بھی تھی...... ہم اپنے ننھیال میں دو ہی لڑکیاں تھیں باقی سب لڑکے ہی لڑکے تھے۔ لہٰذا ہم دونوں خاندان والوں کے لیے بہت چہیتی تھیں...... ہماری لڑائی بھی بہت ہوتی تھی اور پیار بھی بہت تھا مگر اب کچھ عرصے سے ہماری بول چال بند تھی۔ فرحت مجھ سے بھی زیادہ بولڈ تھی...... اسے بھی وہی حالات ملے تھے جو مجھے ملے تھے۔ اس پر اس کی بچپن میں ہی والدہ بھی وفات پا گئیں تھیں میں جب ضد کرکے اگلی کلاس میں داخلہ لے لیتی تو وہ بھی میری آڑ میں میرا حوالہ دیتی ہوئی میرے شانہ بشانہ آن کھڑی ہوتی۔ ہمارا شرارتی بچپن بھی ساتھ گزرا۔ انتہائی سخت حالات میں بھی ہم کچھ نہ کچھ تفریح کا پہلو نکال لیا کرتی تھیں۔

وہ میری ماموں زاد تھی ممانی کی وفات کے بعد ماموں کا گھر بھی میری والدہ کے زیر اثر آ گیا تھا۔ ویسے تو میری والدہ ہی کافی رعب دبدبے والی تھیں مگر جب ممانی کی وفات کے بعد

دونوں امی اور ماموں مل گئے تو ہماری سرزنش میں کئی گنا اضافہ ہوگیا......

اس زمانے کی شرارتیں اور حماقتیں یاد کرتی ہوں تو حیران ہوتی ہوں کہ ہم ماموں اور امی یعنی سخت ترین بہن بھائی سے نبٹنے کے لیے کیسے کیسے دماغ لڑا کر اپنے لیے فرار کی راہیں تلاش کرلیا کرتی تھیں......

ایک دفعہ اسکول کا ون ڈے ٹرپ جانا تھا ہمیں حسبِ معمول اجازت نہ ملی تو ہم نے پرنسپل کی طرف سے ایک خط لکھا...... پورا ڈرامہ کیا...... جب ماموں دروازے کے پاس کسی کام میں مصروف تھے ہم میں سے ایک نے ڈاکیے کا بھیس بدل کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہم میں دوسری بھاگی ہوئی گئی ماموں بھی چوکنے ہوگئے پوچھا کون ہے؟

ہم نے کہا ڈاکیا ایک لفافہ لایا ہے۔ لفافہ ماموں کے حوالے کیا گیا اور ماموں نے پریشر میں آکر ہمیں ٹرپ پر جانے کی اجازت دے دی......

میرے ماموں بہت خوبصورت تھے۔ بیگم کے مرنے کے بعد سارے گھر کے کپڑے دھوبی سے دھلتے تھے وہ ہمیشہ سفید کُرتہ شلوار پہنتے تھے اور ہم اکثر ان کے کرتوں کے بازو کاٹ کر دوپٹے بنالیا کرتیں تھیں اور باقی حصہ کہیں چھپا دیا کرتی تھیں اور دھوبی بے چارے کی ''کُرتے'' گم کرنے پر خوب سرزنش ہوتی تھی......اس زمانے میں گھر کے مددگار بھی گھر کا حصہ ہی ہوتے تھے۔

میرے ماموں ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھے۔ عمر بھر اپنے ساتھ ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر لکھتے تھے۔ زمینیں بھی تھیں روپے پیسے کی کمی نہ تھی مگر ہمیشہ ایک ایک پائی کا حساب لکھتے تھے۔ ہینڈ رائٹنگ انتہائی خوبصورت تھی۔ اگر برسوں بعد بھی ان سے کوئی پوچھتا فلاں بچے کی ڈاکٹری پر کتنا خرچہ آیا تو ان کے پاس ایک ایک پائی کا حساب ہوتا۔

ان کے بعد میں نے صرف علوی صاحب کو اس طرح حساب کتاب لکھتے دیکھا اور اب میرے بچوں میں بھی حساب کتاب کی یہ عادت آگئی ہے۔

ہمارے نئے کپڑوں کی فرمائش پر دونوں بہن بھائی امی اور ماموں پہلے ہمارے سارے کپڑے الماریوں سے نکلواتے پھر گنے جاتے اور اس کے بعد فیصلہ ہوتا کہ نئے کپڑے سلنے چاہیے یا نہیں سلنے چاہیے۔

اس کا حل ہم نے یہ نکالا کہ قمیض کو سینے سے فرش پر رگڑتے وہ گھس جاتی اور پھر وہ قمیض ہم دوپٹہ گلے میں ڈال کر گھر میں پہن کر پھرا کرتے قمیض اپنے نازک حصے سے گھسی ہوئی گھر والوں کے لیے ناقابلِ برداشت اور قابلِ شرم ہو جاتی اور ہمیں بغیر کسی پوچھ گچھ کے فوراً نئے سوٹ مل جاتے۔

جوتا لینا ہوتا تو ماموں دُکان پر جاتے اور جو جوتا اچھا لگتا اس کا ایک ایک حصہ تھیلا بھر کر گھر لے آتے ہم گھر میں پہن پہن کر دیکھتے جو اچھا لگتا ماموں دوبارہ جا کر اس کا دوسرا حصہ لے آتے۔ ہمیں بازار جانے کی بالکل اجازت نہ تھی۔

میٹرک کی الوداعی پارٹی تھی اور ہم دونوں سے کہا گیا کہ جو کپڑے گھر میں پڑے ہیں انہی میں سے کوئی پہن کر جاؤ...... ہمارے لیے یہ نسخہ قابلِ قبول نہ تھا۔

وہ عین شباب کے دن...... دل امنگوں اور آرزوؤں کا مسکن اور ویسے بھی اس عمر میں جتنا دباؤ خواہشیں اتنا ہی سپرنگ کی طرح اچھل اچھل کر باہر آ جاتی ہیں...... پڑھائی میں بھی ہم اچھی تھیں فرحت فرسٹ آتی اور میں سیکنڈ یا پھر تھرڈ...... امورِ خانہ داری کی بھی ہماری کلاس ہوتی تھی اس میں اکثر میں فرسٹ آیا کرتی تھی......

اب ہم نے دماغ لڑانا شروع کر دیا کہ ایسا کیا کریں جو سارے اسکول میں سب سہیلیوں سے منفرد لگیں۔ ہمارے محلے میں ایک لڑکی بیاہ کر آئی تھی...... ویسے تو ہمیں کسی شادی شدہ لڑکی سے ملنے کی اجازت نہ تھی...... مگر اس سے ہماری کچھ کچھ دوستی ہو گئی تھی۔ دونوں گھروں کی چھتیں سانجھی تھیں اور ہم چھت کی دیواروں کے آر پار کھڑی ہو کر گپ شپ لگا لیتی تھیں۔

ہمیں ساڑھی اور غرارہ پہننے کا بہت شوق تھا ہم نے سوچا اس نوبیاہتا سے اس سلسلے میں مشورہ کیا جائے۔ جب ہم موقع نکال کر اس کے پاس گئیں تو اس نے کہا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ تم لوگ میرا غرارہ اور ساڑھی لے لو۔ بڑی ہی جی دار خاتون تھی وگرنہ کون اپنی شادی کا غرارہ اور جہیز کی ساڑھی کسی کو پہننے کے لیے دیتا ہے۔

ہمای تو عید ہو گئی۔ اب ہم نے سوچا میک اَپ بھی ہونا چاہیے ہماری ایک کلاس فیلو اور دوست جس کی امی شادی سے پہلے فلم ایکٹریس رہی تھیں...... اس نے ہم دونوں کو آفر کی کہ

ہمارے گھر آ جانا میری امی ہم تینوں کی تیاری میں مدد بھی کر دیں گی اور میک اَپ بھی کر دیں گی......ہم دونوں نے فوراً حامی بھر لی۔

نہ ہمارے پاس میک اَپ کا سامان تھا نہ ہمیں میک اَپ کرنا آتا تھا ایسے میں ایسی آفر کون کافر قبول نہ کرتا......

اب آخر میں ہمارا زیور کا مسئلہ رہ گیا......فرحت نے مجھے بتایا کہ میں نے ابو کے کمرے میں ایک صندوقچی دیکھی تھی جس میں امی کا سونے کا زیور پڑا ہوا ہے۔ہم موقع کی تاک میں رہیں جونہی موقع ملا صندوقچی سے دو سونے کے سیٹ نکالے ان سب کو بیگ میں ڈالا گھر سے جھوٹ موٹ کے تیار ہوئے اور اس دوست کے گھر پہنچ گئے۔

اس زمانے میں نہ تو زیور کو تالے کے اندر رکھا جاتا تھا اور نہ ہی ہمیں ان سونے کے زیورات کے چوری ہونے کا خیال آیا۔ہم اسکول پہنچے تو بلا شبہ ہم سب سے منفرد لگ رہی تھیں اس زمانے میں میزبان کلاس اپنی سینئرز کو مختلف نام کے ٹائٹل سے تالیوں کی گونج میں نوازتی تھیں......مختلف ورائٹی پروگرامز میں یہ پروگرام بہت ہی دلچسپ ہوتا تھا......اس پروگرام میں فرحت کا قابلیت کی بناء پر کچھ شعر میں نام تھا اور مجھے ''مشرقی حسن'' کا ٹائٹل دیا گیا......

ہم بھرپور طریقے سے اس الوداعی پارٹی سے محظوظ ہوئے۔اس کے بعد غیر رسمی پروگرام یہ تھا کہ ہم دوبارہ اسی سہیلی کے گھر جائیں گے کپڑے بدلیں گے اور اپنی اصلی حالت میں گھر چلے جائیں گے......پارٹی ختم ہوئی تو ہماری وہ دوست ہمیں بتائے بغیر جلدی گھر چلی گئی ہمیں پارٹی کے نشے میں پتہ ہی نہ چلا۔ہمارا گھر اسکول کے نزدیک پیدل ہی کا راستہ تھا......اب ہم کسی اور دوست کے گھر نہیں جا سکتی تھیں کیونکہ مانگے کے کپڑوں کا راز کھلنے کا ڈر تھا ان کپڑوں میں گھر بھی نہیں جا سکتی تھیں۔اسکول میں بھی کپڑے بدلنے کا کوئی اہتمام نہیں تھا۔ہم دونوں بہت پریشان ہوئیں کیونکہ رات بھی ہوگئی تھی۔اب اس کے علاوہ کوئی حل نہیں تھا کہ اسی حالت میں چادر لپیٹ کر گھر جایا جائے۔گھر پہنچے تو ابھی سیڑھیوں پر ہی تھے کہ فرحت کا بھائی اور میرا کزن سیڑھیوں پر آ کر ہمیں چڑانے لگا۔ہوں......آ گئیں مہارانیاں۔ابو تم دونوں کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں......اب آپ لوگوں کا شاہانہ استقبال ہوگا گلے میں ہار ڈالے جائیں گے وہ بھی جوتوں کے......

کتنا مزا آئے گا چوری کا زیور اور مانگے کے کپڑے پہننے کا...... ہمارا تو ڈر کے مارے بُرا حال ہو گیا۔ ہم دونوں کافی دیر آپس میں لڑتی رہیں...... تم نے کہا تھا کہ کپڑے مانگ لیتے ہیں اور تم نے ہی صندوقچی سے زیور نکالنے کا مشورہ دیا تھا......

کافی دیر کھڑا رہنے کے بعد ہمیں معلوم ہو گیا کہ ماموں باہر کسی کام سے گئے ہوئے ہیں۔ فرحت نے میری بازو پکڑی اور کہا چلو چلتے ہیں جو ہو گا دیکھا جائے گا زیادہ سے زیادہ مار ہی پڑے گی نا! پڑ جائے دیکھ لیں گے۔ ہم سیڑھیوں سے بھاگ کے کمرے میں گئے کپڑے بدلے اور زیور اتار کر اسی صندوقچی میں رکھ دیا...... اچانک ہمارے دماغ نے ترکیب سوچی اور ہم نے ممانی کی ایک پرانی بالوں کی وگ ان زیورات کے اوپر رکھ دی۔ اب ہم کپڑے بدل کر اپنی اصلی حالت میں آ چکے تھے کہ ٹک ٹک کی آواز سے چوکنے ہو گئے ماموں ہاتھ میں ہمیشہ کھونٹی رکھتے تھے جس سے ان کی آمد کا پتہ چل جایا کرتا تھا...... ماموں سیدھے ہمارے کمرے میں آ گئے فرحت کے بھائی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ''میرا یہ کزن فرحت کا بھائی بعد میں جناح ہسپتال لاہور میں ایم ایس کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔''

ماموں نے پوچھا کس سے پوچھ کر زیور نکالا تھا۔۔

ہم چپ......

انھوں نے کئی بار پوچھا مگر ہم دونوں سر جھکا کر بیٹھی رہیں پھر انھوں نے صندوقچی منگوائی اور کھول کر دیکھنا چاہا کہ زیور پورا ہی ہے۔ ابھی صندوقچی کھولی ہی تھی کہ نقلی بال دیکھ کر ڈر گئے اور اچھل کر دو قدم پیچھے ہو گئے ہماری دبی دبی ہنسی چھوٹ گئی ماموں جھینپ گئے ان کے لہجے میں بھی نرمی آ گئی اور یوں ہماری جان چھوٹ گئی......

میرا اور میری کزن کا بچپن انہی شرارتوں سے مزین تھا مگر یونیورسٹی میں آ کر ہمارا ہوسٹل مختلف تھا اور ہماری کسی بات پر بول چال بند تھی...... یہ اور بات ہے کہ وہ بول چال بند ہونے اور سخت لڑائی کے باوجود بھی میرے کمرے میں آ کر دھڑلے سے جو چاہتی تھی لے جاتی تھی اور جب چاہتی تھی رکھ جاتی تھی یونیورسٹی تک ہم ایک دوسرے کے کپڑے بھی پہن لیا کرتی تھیں۔ تب دونوں دھان پان سی ہوتی تھیں مگر اب حالات کافی مختلف ہیں۔ فرحت بھی بعد میں پرنسپل کے

عہدے تک پہنچ کر ریٹائرڈ ہوئی۔ چلیے اب دوبارہ سلسلے کو وہیں سے جوڑتے ہیں جہاں سے ٹوٹا تھا۔

قصہ مختصر...... انتخابات کا شور شرابہ اور رونقیں اپنے عروج پر تھیں اور میرے پاس پمفلٹ اور بینرز کے پیسے نہیں تھے......

ایک دن میں صبح اٹھی تو کیا دیکھا پورا ہوسٹل میرے نام کی جھنڈیوں اور بڑے بڑے بینرز سے سجا ہوا ہے۔ میں تو دیکھ کر حیران ہی رہ گئی، بارہا آنکھیں جھپکیں اپنے آپ کو چٹکیاں کاٹیں مگر یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ جناتی حرکت کس نے کی...... کوریڈور میں چوکیدار عدالت ملا۔ یہ وہی عدالت تھا جو میرے بھائی کا مخبر تھا...... اور ہماری پل پل کی خبر اسے پہنچایا کرتا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا...... میں نے پوچھا عدالت مجھے بتاؤ تو سہی یہ سب کس نے کیا...... اس نے بتایا کہ فرحت اپنی دوستوں کے ساتھ آئی تھی ساری رات پوسٹر لگاتی رہی اور اب فجر کے وقت یہ سب مکمل کر کے گئی ہے...... میں لڑائی اور بول چال نہ ہونے کی وجہ سے اس کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکی۔

''ہمارے بھی تھے مہربان کیسے کیسے''

اور پھر الیکشن ہوا اور میں بھاری اکثریت سے جیت گئی۔

یونیورسٹی کا زمانہ

آنکھوں سے مرے اس لیے لالی نہیں جاتی
یادوں سے کوئی رات جو خالی نہیں جاتی

الیکشن جیتنے کے بعد اب ایک نئی ہنگامہ پرور زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔

یوں تو میں نے الیکشن جیتنے سے پہلے بھی بہت سے شوق پالے ہوئے تھے مگر اب تو بات ہی کچھ اور تھی۔ ہوسٹل اور کالج دونوں ہی میں خاصی با اختیار ہو چکی تھی۔ زندگی میں دلچسپیاں ہی دلچسپیاں موجیں ہی موجیں......

الیکشن کے بعد ہی ہمارا سمسٹر کا رزلٹ بھی آ گیا۔ فخر الحق نوری ہمیشہ فرسٹ آتا تھا اور خاور سیکنڈ، جبکہ میں اچھے نمبروں سے پاس ہو جاتی تھی۔ یونیورسٹی میں سمیسٹر سسٹم تھا جس کے لیے پڑھنا بھی بہت پڑتا تھا۔ اسائنمنٹ بنانے کے لیے بھی بہت محنت کرنی پڑتی تھی۔ اکثر رات گئے تک ہم اولڈ کیمپس کی لائبریری میں بیٹھ کر کتابوں سے بھی سر کھپایا کرتے تھے اسی لائبریری میں فخر الحق نوری اور رخسانہ کا عشق بھی شروع ہوا اور پھر کچھ ہی عرصے میں پل کر جوان بھی ہو گیا۔

میری خوش قسمتی تھی کہ خاور جیسی قابل لڑکی سائے کی طرح میرے ساتھ رہتی تھی......اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ امتحان قریب آنے پر میں کچھ پڑھ بھی لیا کرتی تھی......

مگر اس دفعہ ایسا ہوا کہ میں اقبالیات کے مضمون میں فرسٹ آ گئی۔ خاور نے رزلٹ دیکھا تو اسے بہت غصہ آیا......تم اقبالیات میں مجھ سے زیادہ نمبر کیسے لے سکتی ہو...... یہ ہو ہی نہیں سکتا......میں تو پیپر نکلوا کر دیکھوں گی۔ نوری کو بھی بہت عجیب محسوس ہوا اور اس نے بھی پوچھا......تم نے ایسا کیا لکھ دیا کہ ہم دونوں سے زیادہ نمبر آ گئے...... بہر حال پیپر نکلوا کر بھی دیکھا گیا......مگر

انھیں اطمینان نہ ہوا۔

الیکشن جیتنے کے بعد میرے پاس پڑھائی کے لیے اتنا وقت ہی نہیں ہوتا تھا۔لہٰذا وہ لوگ بھی سچے تھے......کہ یہ کھلنڈری سی لڑکی اقبالیات میں اتنے نمبر کیسے لے سکتی ہے......

اس میں شاید اس بات کا کمال تھا کہ مجھے بچپن ہی سے کتابوں کا بہت شوق تھا اس لیے میرا مطالعہ عام لڑکیوں سے بہت وسیع تھا۔سرسری اور آسان باتیں تو میرے اوپر سے گزر جاتی تھیں۔ مگر دقیق اور مشکل مضامین کو سمجھنے میں میرا دماغ بہت چلنا شروع ہو جاتا۔ایک دفعہ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ انارکلی گھوم رہی تھی کہ ایک خاتون نے مجھے دیکھا تو بڑی ہی چاہت سے میرے پاس آئی مجھے گلے لگایا اور بے تکلفی سے باتیں کرنے لگی......میری دوستوں نے پوچھا......

یہ کون تھی؟

میں نے کہا یہ میرے کالج کی لائبریرین تھی۔

انھوں نے حیرت سے کہا ایسا والہانہ پن...... ہماری تو کالج کی لائبریرئن ہمیں جانتی تک نہیں تھی۔

مجھے فلسفہ اقبال ہمیشہ اپنے ذہن اور روح کے قریب لگتا۔ ہمیشہ میرے کلاس فیلو کہا کرتے تھے ہماری کلاس کی لڑکیوں میں سے کوئی اور آگے جائے یا نہ جائے نعیم ضرور معرکہ مارے گی۔

اورینٹل کالج میں پڑھائی کے علاوہ میرے اور بھی بہت سے مشاغل تھے۔

میں باقاعدگی سے ریڈیو پروگرام میں ہر ہفتے افسانہ بھی پڑھتی تھی۔جس سے پندرہ روپے ملتے تھے ان پندرہ روپوں سے میں انارکلی کے فٹ پاتھ سے پرانی کتابیں خریدا کرتی تھی۔

اس زمانے میں بھی کتابوں کی ناقدری کا احساس جنم لینے لگا تھا۔ بہت ہی اعلیٰ کتابیں جو ابھی نئی نئی چھپی ہوتی تھیں ہمیں فٹ پاتھ سے مل جایا کرتی تھیں......

پنجاب یونیورسٹی کی اخبار جامعہ کی مجلس ادارت میں بھی تھی۔اور اس کے لیے خبریں اور کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی تھی خصوصاً میری سروے رپورٹ ہر شمارے میں ضرور ہوتی تھی۔ٹی وی پروگرامز میں بھی جایا کرتی تھی گو ہوسٹل سے نکلنا مشکل تھا مگر کسی نہ کسی طرح کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آتی تھی۔

ایک دفعہ ٹی وی پر ڈاکٹر رفیق صاحب کے ساتھ پروگرام تھا جو پنجاب یونیورسٹی کے وائس

چانسلر بھی رہے......ایک ٹی وی مذاکرے میں طلباء نے ان سے سوال کرنے تھے۔ وہ پروگرام میں بروقت نہ پہنچ سکے۔ ہمارے ہوسٹل کے اصول وضوابط میں تھا کہ سات بجے آپ نے ہر حال میں ہوسٹل پہنچ کر حاضری لگانی ہوتی تھی۔ اگر کبھی سات بجے کے بعد آنا ہوتا تو وارڈن کو باقاعدہ درخواست دے کر اجازت لینی پڑتی تھی۔ اس قانون کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ اگر آپ رات گزار کر صبح آ جائیں تو کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوتی تھی...... ہیڈ گرل بننے کے بعد بہت سے راز کھلے کہ کچھ لڑکیاں اس سے ناجائز فائدہ بھی اٹھاتی تھیں......

ہم ہوسٹل سٹوڈنٹ ٹی وی اسٹیشن میں بیٹھی تھیں اور جوں جوں دیر ہو رہی تھی۔ ہماری جان نکلی جا رہی تھی، پروڈیوسر ہمیں بار بار کسی نہ کسی طرح روک لیتا۔ آخر ہماری ہمت جواب دے گئی اور ہم نے کہا ہم جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر رفیق سے بات ہوئی تو انھوں نے کہا مجھے ہوسٹل کی وارڈن کا فون نمبر دو میں ان سے خود بات کر لیتا ہوں......انھوں نے وارڈن سے بات کر کے ہمارے لیے خصوصی اجازت لی اور پھر پروگرام ختم ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب خود ہمیں ہوسٹل پہنچا کر آئے اور ہماری وارڈن سے بھی ملے۔

ہوسٹل کا ہر فیصلہ بطور ہیڈ گرل میرے مشورے سے ہوتا تھا۔ میری انتظامی صلاحیتیں بھی کھل کر سامنے آئیں اور میں نے بھی مختلف طریقوں سے اپنے ہوسٹل کے لیے بہت کچھ کیا۔

ہمارے ہوسٹل میں بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی تھا۔ ہوسٹل کے بجٹ میں نئے ٹی وی کی گنجائش نہیں تھی۔ میرے ذہن میں ترکیب آئی کہ کوئی فنکشن کیا جائے اور اس کے لیے کوئی ڈونر ڈھونڈا جائے۔ دوستوں میں اس تجویز کی خوب تشہیر کی۔ کسی نے ایک سرمایہ دار کا بتایا کہ اگر اس کو لڑکیوں کے ہوسٹل میں چیف گیسٹ کے طور پر بلایا جائے تو وہ پیسہ دے دیگا مگر اس کی بیوی کو پتہ نہ چلے۔

مخبر ہمارا اور ڈونر کا مشترکہ دوست بھی تھا۔ ہم نے حسبِ پروگرام اس کی بیوی کو کان وکان خبر نہ ہونے دی اور اس کے دفتر اسے دعوت دینے کے لیے چلی گئیں......اس نے ایک ہی شرط لگائی کہ مجھے تقریر کے لیے نہ کہا جائے...... ہم نے کہا بالکل نہیں کہا جائے گا اور یوں وہ شخص ہمیں بیس ہزار کیش دے گیا۔ تینوں ہوسٹلوں میں ہماری بڑی واہ واہ ہوئی اور یوں ہم نے اس رقم سے بڑا کلرڈ ٹی وی لے لیا اور پرانا ڈائنگ ہال میں رکھ لیا۔ اس زمانے میں صرف ہمارے ہوسٹل میں دو ٹی وی

ہوتے تھے......اسی طرح ایک ڈونر ڈھونڈ کر ہم نے ہیٹر وغیرہ بھی خریدے تھے......

ہوسٹل لیول پر چھوٹی سی لیڈری کو ملک کے وسیع تناظر میں دیکھتی اور سوچتی ہوں تو بہت سی چیزیں صاف اور شفاف ہو کر واضح ہوتی چلی جاتی ہیں...... کہ لیڈر کس کس طرح سے لوگوں کو بے وقوف بنا سکتا ہے اور عوام کس کس طرح سے بے وقوف بنتی چلی جاتی ہے۔ کئی ہفتوں سے پروگرام بن رہا تھا کہ ہوسٹل کی لڑکیوں کو سیر کے لیے کہیں باہر لے کر جایا جائے۔ پروگرام فائنل ہی نہیں ہو رہا تھا ایک دِن میں نے خود ہی تربیلا ڈیم کے لیے پروگرام ترتیب دے کر نوٹس بورڈ پر لگا دیا لڑکیاں بہت خوش ہوئیں اور انھوں نے پیسے بھی جمع کروانے شروع کر دیئے۔

میری سہیلیوں کو پتہ چلا تو وہ سخت ناراض ہوئیں اور انھوں نے کہا کہ ہم تو مری برف باری دیکھنے جائیں گی۔ بہت بحث ہوئی مگر وہ نہ مانیں اور انھوں نے صاف کہہ دیا کہ ہم تربیلا تمہارے ساتھ نہیں جائیں گے۔ تفریح کا لطف تو دوستوں کے ساتھ ہی آتا ہے میں بہت پریشان ہوئی اور رات بھر سوچتی رہی کہ کیا کرنا چاہیے۔ آخر کار ایک ترکیب ذہن میں آئی اور میں نے اگلے دن پورا پروگرام بدل دیا اور نوٹس بورڈ پر لکھ دیا کہ بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر ہم نے تربیلا کی بجائے مری جانے کا پروگرام بنایا ہے۔

جو لڑکیاں پیسے جمع کروا چکی تھیں انھوں نے پوچھا تو میں نے ان کو ممکنہ اور غیر ممکنہ تمام خدشات سے آگاہ کر کے منا لیا۔ دو گروپ بن گئے ایک نے کہا مری جائیں گے دوسرے نے کہا تربیلا جائیں گے۔ آپس میں لڑتی جھگڑتی رہیں اور آخر میں فیصلہ مری کے حق میں ہو گیا۔ جمعیت والوں نے تمام انتظامات بھی کر دیئے۔ دو بھائیوں جیسے لڑکے بھی ہماری حفاظت کے لیے مختص کر دیئے اور یوں ہم پوری بس بھر کر جن میں کچھ غیر ملکی لڑکیاں بھی تھیں مری کے لیے روانہ ہو گئیں۔ بڑا یادگار ٹرپ تھا۔ گانے ٹپے ماہیے لطیفے...... ہمارے ساتھ ایک جوان ڈرائیور اور دو جمعیت کے لڑکے تھے پورا راستہ وہ بیچارے لڑکیوں کے عتاب کا نشانہ بنے رہے...... مجھے یاد ہے لڑکیوں نے انھیں خوب اُلو بھی بنایا اور ان سے خوب پیسے بھی بٹورے۔ ڈرائیور تو خوب فراخدلی سے پیسے دیتا رہا۔

ایک لڑکی نے ڈرائیور پر جملہ کسا بیچارہ خالی جیب گھر جائے گا تو بیوی کو کیا پیش کرے گا۔

پیچھے سے کسی نے گرہ لگائی...... کیلے اور کینو!

میرے اوپر تو ذمہ داری کا بوجھ بہت تھا...... ایک دفعہ تو بس میں آگ بھی لگ گئی "دھویں سے بس بھر گئی" رات کا دوسرا پہر تھا۔ وہ چیخ پکار ہوئی کہ دل دہل گیا۔ سخت سردی میں پوری بس سڑک پر آ کھڑی ہوئی۔ خوفناک منظر تھا...... مگر جلد ہی ڈرائیور نے بتایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں مجھے نقص کا پتہ چل گیا ہے پنڈی جا کر کسی میکینک سے ٹھیک کروالیں گے فی الحال کوئی خطرہ نہیں......

ہم بس میں بیٹھ تو گئے کیونکہ اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا پنڈی پہنچے تو بس پھر کسی خرابی کی نشاندہی کرنے لگی۔ اتفاق سے نزدیک ہی ہماری ایک ساتھی کا گھر تھا اس نے ہمیں اپنے گھر رُکنے کی آفر کر دی۔ سو ہم اس کے گھر رُک گئے۔

اس کا ڈرائنگ روم اتنا بڑا تھا کہ پوری بس اس میں سما گئی مگر سردی اتنی تھی کہ ہیٹر جلانے کے باوجود ہم کانپتے رہے گھر والوں نے ہمیں گرم گرم چائے پلائی جس سے ہماری جان میں جان آئی۔ بس والا بس لے کر میکینک کے پاس چلا گیا......

میری دوستوں کو اچانک کسی رشتے دار کے گھر جانے کا خیال آ گیا میں نے بہت روکا...... مگر وہ پھر بھی چلی گئیں...... میں نے انھیں تنبیہ کی کہ اگر بس ٹھیک ہو کر آ گئی تو میں تم لوگوں کا انتظار نہیں کروں گی مگر انھیں زعم تھا کہ نعیم ایسا ہرگز نہیں کر سکتی۔ جونہی وہ گئیں بس ٹھیک ہو کر آ گئی اور میں اپنی سہیلیوں کا پورا گروپ چھوڑ کر باقی لوگوں کے ساتھ مری کے لیے روانہ ہو گئی۔ میں نے سوچا پوری بس ان لڑکیوں کے غیر اصولی فیصلے سے ہونے والی بدمزگی کو کیوں بھگتیں۔ بھلے ہی وہ میری دوست ہیں......

بہر حال پھر کافی دیر بعد ان کے رشتے دار نے انھیں اپنی گاڑی میں مری پہنچایا۔ مری کا ٹھنڈا دن آج بھی یاد آتا ہے تو کانپ کے رہ جاتی ہوں۔ دسمبر کا مہینہ تھا برف باری ہو رہی تھی، ڈبل جرابیں بھی ناکافی ہو رہی تھیں مگر لڑکیاں اس کے باوجود بہت لطف اندوز ہوئیں اور یہ ایک یادگار ٹرپ کے طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یادوں میں محفوظ ہو گیا۔

ہوسٹل میں جہاں رعب دبدبہ اور عزت تھی اتنی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی تھا۔ خاص طور پر کھانے کا بجٹ بنانا اور لڑکیوں کو خوش بھی رکھنا کوئی آسان بات نہ تھی...... میرے ساتھ اس سلسلے

میں جغرافیے کی ایک لڑکی تھی جو بجٹ میں انقلابی تبدیلیاں لائی۔ہم کھانے کی چیزوں کی خریداری پر ہونے والے غبن پر بھی پوری نظر رکھتے تھے۔جس سے بجٹ پر بھی بہت اچھا اثر پڑا۔ہمارے ہوسٹل کا انتظام بلاشبہ بہت اعلیٰ تھا۔

ہوسٹل کے کمروں میں کچھ باہر کی لڑکیاں بھی آ کر رہنے لگتی تھیں جن پر کڑی نظر رکھنا، رات کو ہوسٹل کا راؤنڈ لینا...... حاضری والے رجسٹر کو چیک کرنا، لڑکیوں کو باہر جانے کی اجازت دینا۔ ان سب کاموں کی ذمہ داری مجھ پر تھی۔

مجھے معلوم ہوتا تھا کہ کون سی لڑکی کب رات گزار کر آئی ہے؟ کون کس کی پناہ میں ہوسٹل میں رہ رہی ہے۔

جمعیت والے نرے بھائی ہی نہیں ہوتے تھے۔ایک اہم لیڈر کی محبوبہ جو ڈاکٹر تھی اسے میں نے وارڈن سے خصوصی اجازت لے کر سال بھر ہوسٹل میں رکھا تھا۔وہ چوری چوری اس سے ملنے بھی آتا جس کو خفیہ رکھنے کا اہتمام بھی میں ہی کرتی تھی۔

ہوسٹل میں بہت سی لڑکیاں سخت پردے میں آتی تھیں اور پھر کچھ ہی عرصے میں ان کے پَر پُرزے نکلنے شروع ہو جاتے برقعہ اترتا دوپٹہ گلے میں جاتا اور پھر کپڑوں کی وضع قطع ہی بدل جاتی۔

چلو وضع قطع بدلنے تک تو پھر بھی گوارا تھا...... وہ تو اس سے بھی بہت آگے بڑھ جایا کرتی تھیں۔

ہوسٹلوں کے اردگرد منڈلانے والے دلال بھی کسی نہ کسی سے دوستی کر کے ہوسٹل تک رسائی حاصل کر لیتے تھے۔معصوم اور بھولی بھالی لڑکیاں بعض اوقات اپنی مرضی سے اور بعض اوقات دوسروں کے مکروفریب سے کسی نہ کسی چکر میں پھنس جایا کرتی تھیں......

یونیورسٹی کے شروع کے دن تھے میں ایک ہوسٹل سے دوسرے ہوسٹل جا رہی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر شخص نے مجھ سے کسی لڑکی کا پتہ پوچھا، مجھے معلوم نہ تھا۔میں نے کہا نئی آئی ہوں اس لیے زیادہ لوگوں کو نہیں جانتی...... پھر اس نے مجھ سے میرا ڈیپارٹمنٹ اور روم نمبر بھی پوچھا۔یہ بات ہماری سینئر دوستوں نے سمجھا دی تھی کہ کبھی کسی کو صحیح روم نمبر اور ڈیپارٹمنٹ نہ بتانا۔میری چھٹی حس بیدار ہو گئی اور میں نے اپنے ڈیپارٹمنٹ اور روم نمبر کی غلط نشاندہی کی......

میری ایک دور پار کی کزن جو مجھ سے سینئر تھی وہ مجھے اس ادھیڑ عمر مرد سے گفتگو کرتے ہوئے اپنے کمرے سے دیکھ رہی تھی۔ بھاگی بھاگی میرے پاس آئی اور مجھے کہا تم اس شخص سے کیوں بات کر رہی تھی۔ تمھیں معلوم ہے یہ بہت بدنام اور مشہور دلال ہے۔ اسے کئی دفعہ تنبیہ کی گئی ہے کہ ہوسٹل کی حدود میں داخل نہیں ہوسکتا مگر نجانے کیوں پھر کسی نہ کسی طرح آ جاتا ہے۔ میں نے کہا فکر نہ کرو میں نے اسے کچھ بھی صحیح نہیں بتایا۔

مجھے یاد ہے ایک بہت اچھے گھرانے کی لڑکی دوستوں کے گروپ میں پھنس کر دھوکہ کھا بیٹھی۔ پھر اس کے ایک دوست نے اس سے شادی کر کے اس کو تحفظ دیا......

وہ شادی کے بعد بھی ہوسٹل میں رہتی تھی اور ہر نئی لڑکی کو بٹھا کر اپنی گمراہی کی داستان سناتی تھی۔ تاکہ اس کے ساتھ جو ہوا کسی اور کے ساتھ نہ ہو...... یقیناً یہ صدقہ جاریہ تھا ممکن ہے لڑکیوں نے اس سے بہت کچھ سیکھا ہو...... یہ بڑی جرأت کی بات تھی۔

ایک دفعہ رات کے دو بجے چوکیدار نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور بتایا کہ ایک عورت بُری طرح رو رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ یونین کی کسی ذمہ دار لڑکی کو بلاؤ۔ میں بات کرنا چاہتی ہوں۔

میں آنکھیں ملتی ہوئی گئی تو ایک عورت نے مجھے بتایا کہ آپ کے ہوسٹل کی فلاں لڑکی اس وقت فلاں ہوٹل میں میرے شوہر کے ساتھ ہے...... براہ کرم میری مدد کرو...... اس نے بتایا میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں وہ دیر تک بلک بلک کر روتی رہی۔

میں کیا کر سکتی تھی...... وارڈن بھی کیا کر سکتی تھی۔ پھر ہم نے مل کر ہوسٹل کے قانون بدلے اور رات کو نہ آنے والی لڑکیوں کا الگ سے رجسٹر بنایا اور انھیں بلا کر ان کی سرزنش بھی کیا کرتے تھے۔

بعد میں اس لڑکی کی شادی ایک بہت ہی امیر اور پڑھے لکھے گھرانے میں ہوئی اس کا شوہر کنگ ایڈورڈ کالج کا مشہور ڈاکٹر تھا۔ وہ لڑکی اپنی پرانی زندگی سے تو تائب ہوگئی تھی اور یونیورسٹی کی کسی بھی پرانی دوست سے نہیں ملتی تھی۔ کسی تعلق سے میری ملاقات ہوئی تو اس کا رنگ اڑ گیا۔ پھر اس نے ایک کمرے میں لے جا کر میرے آگے ہاتھ جوڑے کہ میرے سسرال

میں کوئی بات نہ کرنا......

مجھے کیا پڑی تھی کہ میں اس کا ہنستا بستا گھر اجاڑنے کی کوشش کرتی میں نے دوبارہ اس سے کبھی ملنے کی کوشش نہیں کی۔

ایک دفعہ تینوں ہوسٹلوں کے درمیان کوئی نوزائیدہ بچہ پھینک کر چلا گیا۔ ہمیں معلوم ہوا تو ہم سب نے جمعیت والوں کی مدد سے بڑی مشکل سے یہ معاملہ رفع دفع کروایا ہمارے لیے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ یہ خبر کہیں پریس والوں کو نہ پتہ چل جائے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بچہ کوئی باہر سے پھینک کر گیا تھا۔

ایسی سینکڑوں داستانیں تھیں جن کو میں اپنی وارڈن کے ساتھ مل کر سلجھانے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ پورا سال اتنا ہنگامہ پرور تھا کہ سال گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔

جو جوڑے بننے تھے بن چکے تھے جن کی قسمت میں رسوائی تھی وہ بھی وصول کر چکے تھے۔

جنھیں درد کی دولت ملنی تھی وہ بھی دامنِ دل میں اس ناسور کو سنبھال چکے تھے۔

ایک دفعہ ایک بہت ذہین اور قابل لڑکا جس کی وجہ شہرت یہ تھی کہ وہ کبھی لڑکیوں سے بات نہیں کرتا تھا، میرے پاس آیا اور کہا ''آپ ڈارک لپ اسٹک نہ لگایا کریں پاگل کر دیتی ہیں۔''

میں نے قہقہہ لگا کر بات کو ہوا میں اڑا دیا......

ایک دفعہ ایک شناسا شاعر اپنے کچھ اشعار لے کر آیا اور کہا:

یہ شعر صرف آپ کے لیے ہیں

قبول کیجیے

میں نے سب سے پہلے اس کے نام پر مار کر پھیرا اور پھر ان اشعار کو اپنی تجوری میں سنبھال لیا

ایسا نہیں تھا کہ چھلکتے سلگتے احساسات کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی۔

دراصل میں جس چادر میں لپٹی یونیورسٹی گئی تھی مجھے اسی چادر میں ہی لپٹے واپس گھر لوٹنا تھا۔

سو میں نے اس چادر کو اسی سفیدی اور شفافیت کے ساتھ لپیٹا اور واپس گھر جانے کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔

اورئینٹل کالج میں تمام ڈیپارٹمنٹ نے ہمیں فیئر ویل پارٹی دی...... اکثر دوستوں کی اس

زمانے میں ہی مظفرآباد سلیکشن ہوگئی تھی۔ مجھے میرے گھر سے پیغامات مل رہے تھے کہ فوراً گھر واپس آؤ...... یونیورسٹی میں اتنا بھرپور وقت گزارنے کے بعد مجھے گھر جانے سے وحشت ہو رہی تھی۔ کیونکہ گھر والوں نے کہہ دیا تھا کہ نوکری نہیں کرنی بس اب بہت ہوگیا تمہارے سارے شوق پورے ہوگئے اب تمھاری شادی ہی ہوگی...... میں نے بہت کہا کہ جب تک شادی نہیں ہوتی میں پی ایچ ڈی کر لیتی ہوں مگر اب میرے تمام حربے ناکام ہو چکے تھے اور قدرت مجھے کسی اور ہی امتحان کے لیے تیار کرنا چاہ رہی تھی۔

اورئینٹل کالج میں فیئر ویل پارٹی کے لیے طالب علموں نے بہت تیاریاں کیں...... میں نے کسی قسم کی کوئی تیاری نہیں کی تھی دل آزردہ تھا...... میری دوستوں نے بہت کہا مگر میں ایک پرانے سوٹ اور پرانے جوتے پہن کر ہی پارٹی میں شامل ہوئی۔

ہماری جونیئر کلاس نے چند کرسیاں اسٹیج پر رکھی ہوئی تھیں۔ پروگرام ہوسٹ کرنے والے لڑکے نے کہا۔ ہم نے اورئینٹل کالج کے چند نمائندہ طالب علموں کے لیے یہ کرسیاں رکھی ہیں۔ کرسیوں کے پیچھے ان کو دیئے گئے ٹائٹل لگے ہیں۔ جس کا نام بلایا جائے گا وہ اسٹیج پر آکر اپنا ٹائٹل پہچان کر بیٹھ جائے گا۔ غلط کرسی پر بیٹھنے والے کو تالیوں کی گونج میں خوب گھمایا جاتا اور جب تک وہ اپنا نام پہچان کر کرسی پر نہ بیٹھ جاتا تالیاں سیٹیاں اور جگت بازی چلتی رہتی...... میں اداس ایک طرف کونے میں بیٹھی تھی سادہ کپڑوں میں بجھی بجھی سی...... میری سب دوستیں بھرپور طریقے کے ساتھ تیار ہو کر آئی تھیں......

اتنے میں میرا نام پکارا گیا۔ میں اسٹیج پر آئی اور سات آٹھ کرسیوں کے پیچھے لکھے ٹائٹل دیکھ کر میرے تو پاؤں تلے سے زمین ہی سرک گئی۔

جونیئرز نے نہ جانے کس چیز کا بدلہ لیا تھا۔

ٹائٹل انتہائی شرمناک...... واہیات اور گھٹیا تھے۔ اسٹیج پر نمائندہ سٹوڈنٹ کے طور پر خوشی خوشی آ کر انھیں قبول کرنا اور ان کرسیوں پر تالیوں کی گونج میں بیٹھنا اور پھر اپنا نام بلند آواز میں بتانا باعث ذلت تھا......

اگر کوئی لڑکا ٹائٹل دیکھ کر اسٹیج سے نیچے آنے کی کوشش کرتا تو شرارتی لڑکوں کا گروپ

پروگرام کے مطابق انھیں گھیر لیتا۔ سینئرز کے پاس ان ٹائٹل کو قبول کر کے ان کرسیوں پر بیٹھنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

میں اسٹیج پر آئی سب کرسیوں کو دیکھا صرف ایک کرسی تھی جس پر شریفانہ نام تھا میں اس پر جا کر بیٹھ گئی......قبولیت کی تالیاں بجیں اور عزت افزائی کے جملوں سے پزیرائی ہوئی اور یوں میں رسوائی سے بال بال بچ گئی......

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

ہم جب یونیورسٹی میں داخل ہوئے تو دولڑکے بہت ہی مشہور تھے طارق شیلےاور آزاد۔ان میں سے ایک سانولا سلونا چھوٹے سے قد کا تھا وضع قطع سے بنگالی لگتا تھا۔ دوسرا تھوڑا صاف رنگت کا تھا۔

یہ دونوں لڑکے لڑکیوں میں بہت ہی مشہور تھے۔ ہوسٹل سے نکلتے ہی ہرلڑکی کی خواہش ہوتی تھی، کاش ان سے ملاقات ہو جائے۔ان کا نام لیتے ہی ان کی جگتیں اور جملہ بازی لڑکیوں کا موضوع گفتگو رہتی۔ جملے کسنے کا ان کا اپنا انداز تھا۔ وہ ہرلڑکی کی بہت عزت کرتے تھےاورلڑکیوں کو دیکھتے ہی ان کی طبیعت ایسی موزوں ہو جاتی کہ بارش کے قطروں کی طرح ان کے مسکراتے ہونٹوں اور شرارتی آنکھوں سے جملوں کی برسات ہونے لگتی۔

انکا کمال یہ تھا کہ اپنی مخاطب عام سی لڑکی کو بھی اپنے خوبصورت جملوں سے خاص بنا دیا کرتے تھے۔ کبھی کسی کی تضحیک نہیں کرتے تھے۔ کبھی کسی کا مذاق نہیں اڑاتے تھے۔ ایسے خوبصورت جملے کستے کہ ہرلڑکی کی خواہش ہوتی کہ کاش وہ انھیں راستے میں کہیں مل جائیں اوران پر کوئی جملہ کس دیں۔

مجھے بھی انھیں دیکھنے اور ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ ایک دفعہ بس میں ملاقات ہوئی تو انھوں نے مجھ پر بھی کوئی جملہ چست کیا تھا جو میں بھول گئی......

بہر حال رات کو ٹی وی لاؤنج میں بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی پر دوستوں کا مل کر چترہار دیکھنا آوازیں کسنا...... کیسی کیسی باغ و بہار شخصیتیں تھیں جن کے دم سے ماحول بدل جاتا اور زندگی کا لطف وسرور بڑھ جایا کرتا تھا۔ کبھی دل چاہتا تو نہر پر واک کرنے چلے جاتے، گنے کا رس پیتے اور

ہنستے ہنساتے لوٹ پوٹ ہوجایا کرتے تھے۔
کبھی یونیورسٹی کی سڑکوں پر چہل قدمی کرتے ایک طرف لڑکیوں کی ٹولیاں ہوتیں اور دوسری طرف لڑکوں کی۔ نہ واک ختم ہوتی نہ ہنسی مذاق نہ جملے بازیاں نہ خوشی کا یہ زمانہ......
میرے بھائی نے مجھے سختی سے منع کیا ہوا تھا کہ اگر یونیورسٹی میں کہیں گھومتے ہوئے ہمارا آمنا سامنا ہوجائے تو یاد رکھنا...... ''ہمارا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں کوئی جان پہچان نہیں کوئی رشتے داری نہیں۔''
ویسے تو میں اس تعلق کو بہت اچھی طرح سے نبھاتی تھی لیکن اکثر رگِ شرارت بھڑک اٹھتی خود انجانے پن کی ایکٹنگ کرتی اور سہیلیوں سے کہتی ذرا اس لڑکے کی کٹ لگاؤ۔
جونہی میرے بھائی کو احساس ہوتا کہ مجھے نشانہ بنایا جارہا ہے۔ یہ وہاں سے بھاگ جاتا اور پھر کہیں نظر نہ آتا...... بیچارہ شریف لڑکا مشرقی لڑکی کی طرح جیسے عزت و آبرو سے آیا تھا اسی طرح عزت و آبرو بچا کر واپس گھر چلا گیا۔
حال ہی میں اسلام آباد میں ائیر پورٹ منیجر کے طور ریٹائر ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام آباد ائیر پورٹ کی تاریخ میں یہ پہلا آفیسر تھا جسے ریٹائرمنٹ کے بعد پھولوں کے ہار پہنا کر اور پھولوں کی پتیاں نچھاور کر کے اشکبار آنکھوں سے رخصت کیا گیا۔
اورئینٹل کالج چونکہ اولڈ کیمپس میں تھا اور میں نیو کیمپس کے ہوسٹل نمبر تین مریم ہال میں رہتی تھی لہٰذا روز بس میں نیو کیمپس سے اولڈ کیمپس طویل سفر کر کے جانا پڑتا تھا۔ یہ طویل سفر ہمیشہ میرے لیے خوشگوار ہی ہوتا۔
اس زمانے میں ہم ہیل پہن کر ٹک ٹک کرتی کتنا ہی پیدل سفر کرلیا کرتی تھیں۔ کبھی انارکلی کی گلیاں ماپتیں...... بانو بازار کی چاٹ کھاتیں، فٹ پاتھ پر بیٹھ کر ریت میں دبی چھلیاں کھائی جاتیں اور کبھی انارکلی کے فٹ پاتھوں سے مطلب کی کتابیں ڈھونڈنے نکل جایا کرتیں...... بسا اوقات انارکلی کے ایک کونے میں بیٹھے پامسٹ سے کچھ راز دار سہیلیوں کے ساتھ قسمت کا حال پوچھنے کے لیے پہنچ جاتیں اور جب پامسٹ خوش کرنے کے لیے کہتا تم بہت خوش قسمت ہو بہت محبت کرنے والا شوہر ملے گا تو ہمارے خواب بھی رنگین ہوجایا کرتے تھے۔

اچھرہ کے بازار بھی ہماری دسترس میں تھے...... مجھے یاد ہے گرمی لگتی نہ سردی نہ اونچی ہیل سے کوئی مسئلہ ہوتا گرمیوں کی دوپہر میں جب سڑکوں پر تارکول پگھلنے لگتی تو میری ہیل اس کے ساتھ چپک جایا کرتی تھی کس مشکل سے میں ہیل کھینچ کھینچ کر نکالتی مگر پیدل چلنے سے نہ گھبراتی......

سستے کپڑے ڈھونڈتے، سیل والے جوتے تلاش کرتے اور پھر انھیں پہن کر خوب اتراتے ہوئے گنگناتے ''رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن......''

انھی راستوں اور منزلوں کی خاک چومتے اور مستی میں جھومتے زمانے میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مجھے اور میری دوستوں میں کافی عرصے تک کھلبلی سی مچائے رکھی۔

ایک لڑکا جس کی نیلی آنکھیں گوری رنگت اور بھورے بال تھے ہمارے پیچھے لگ گیا۔ شروع میں تو ہم نے مذاق ہی سمجھا۔ ویسے بھی ہم لوگ گروپ میں نکلتے تھے۔ لہٰذا معلوم ہی نہ ہوسکا کہ یہ کس کا پیچھا کرتا ہے۔ ہم لوگ مل بیٹھتے تو اس لڑکے کا خوب مذاق اڑاتے اور کہتے بھئی اس لڑکے سے جو بھی شادی کرے گا اس کے بچے بہت خوبصورت ہوں گے۔

ہم کئی ہفتے اس کا مذاق اڑاتے رہے اور اس شش و پنج میں رہے کہ یہ ہمارے گروپ میں سے کس لڑکی کا پیچھا کرتا ہے۔

ہمارے گروپ میں مختلف ڈیپارٹمنٹ کی لڑکیاں تھیں۔ لہٰذا کافی عرصے تک معلوم ہی نہ ہو سکا کہ یہ اتنا تردد کس کے لیے کرتا ہے۔ یونیورسٹی جاتے ہوئے ہمارا گروپ بکھر جاتا...... اورینٹل کالج جانے کے لیے میں اور خاور ہی رہ جاتیں ہماری کلاسز بھی اکٹھی ہوتی تھیں۔ لہٰذا ہم بس میں بھی اکٹھی ہی سفر کیا کرتی تھیں۔ ہم باتیں کرتی ہوئی ایک دوسرے میں گم رہتیں گردوپیش کی ہوش ہی نہ ہوتی۔

ایک دن کیا ہوا ہم نے دیکھا وہ لڑکا خاموشی سے سفر کرتا ہوا ہمارے ساتھ اورینٹل کالج تک آ گیا۔ ہماری تو جان ہی نکل گئی۔ ہم اپنے دوستوں میں بڑی ہی من موجی سی مشہور تھیں۔ لڑکے ہم سے بات کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ کچھ شریف سے بھائیوں جیسے بے ضرر سے لڑکے ضرور ہمارے گروپ کا حصہ تھے......

ان میں سے ایک سے میری جٹی دوست اسائنمنٹ بھی بنوایا کرتی تھی۔ وہ بے چارہ اپنی

اسائمنٹ بنائے یا نہ بنائے اس کی ضرور بنا دیا کرتا تھا۔ ہماری یہ جٹی دوست بہت بڑے زمیندار گھرانے کی اونچی لمبی مٹیار تھی۔ ہم ان کے گاؤں جا کر بہت مزے کرتے تھے۔ حویلی نما گھر تھا جس میں کنواں بھی ہوتا تھا۔

اس کے آغا جی مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی میں شمولیت کی دعوت دینے اور مجھے خصوصی طور پر لینے میرے گھر بھی آئے۔

اونچی خاص قسم کی پگڑی انگلیوں میں سگار بڑی سی گاڑی ساتھ گن مین۔ میرے گھر والوں نے تو ان کی شخصیت ہی سے مرعوب ہو کر مجھے شادی میں جانے کی اجازت دے دی تھی۔ میری یہ دوست مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔ اکثر گاڑی سے اترتے ہی پوچھتی نعیم آئی ہے۔ اگر پتہ چلتا میں نے کسی وجہ سے چھٹی کی ہے تو وہ انھی قدموں واپس لوٹ جاتی۔ ان دنوں میری دو باڈی گارڈز تھیں ایک طرف خاور دوسری طرف یہ جٹی بوجوہ ان کا نام نہیں لکھ سکتی۔ میں دل کھول کر شرارتیں کرتی، ہلہ گلہ کرتی اور جب کسی مشکل میں پھنستی تو یہ دونوں میری طرف داری کے لیے مورچے سنبھال لیتیں۔ انھوں نے خود ہی میری حفاظت کا ذمہ اٹھالیا تھا......

اب ایسے حالات میں اس لڑکے کا یوں پیچھا کرنے سے ہم نے سوچا ہماری بہت سبکی ہوگی۔ اورئینٹل کالج میں لوگوں کو پتہ چلا تو ہمارا انداق بنے گا۔ ایک دن راستے میں رُک کر خاور نے اسے ڈانٹا اور پوچھا کیا چاہتے ہو؟

اس نے کہا میڈم حوصلہ رکھیں میں آپ کے پیچھے نہیں آتا۔

اب باقی رہ جانے والی خاور کی سہیلی کی تو جان ہی نکل گئی۔ اس لڑکے نے ''اس کی طرف'' دیکھتے ہوئے کہا میں تو آپ کے پیچھے آتا ہوں......

خاور نے بہت سبکی محسوس کی۔ اس دن بات نکھر کر سامنے آ گئی اور ہماری تمام سہیلیوں کو بھی پتہ چل گیا اور ہماری تو نیندیں حرام ہو گئیں۔ امی نے یونیورسٹی بھیجنے سے ایک دن پہلے ''اپنی پراپرٹی''، یعنی مجھے اپنے ساتھ لپٹا کر سمجھایا تھا۔ اب خاندان کی اور ہماری عزت تمھارے ہاتھ میں ہے۔ یہ یاد رکھنا میں ایک وظیفہ کرتی ہوں جس سے تمھاری ساری مصروفیات میری آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں اور اگر تم نے کسی لڑکے کے ساتھ بات بھی کی تو میں اپنے وظیفے کے ذریعے دیکھ

لوں گی اور پھر کان سے پکڑ کر وہاں سے گھر واپس لے آؤں گی۔ میں نے اپنی ماں کو سمجھایا اماں فکر ہی نہ کریں۔ آپ کی بیٹی جس عزت و آبرو کے ساتھ جا رہی ہے اسی عزت آبرو کے ساتھ واپس آئے گی۔ اور ویسے بھی میں جس ہوسٹل میں رہوں گی وہاں صرف لڑکیاں ہوں گی اور جس کلاس میں پڑھوں گی وہاں کلاس روم میں پردہ ہوتا ہے نہ لڑکے لڑکیوں کو دیکھ سکتے ہیں نہ لڑکیاں لڑکوں کو......اور کلاس ختم ہوتے ہی اپنے اپنے ہوسٹلوں میں اللہ اللہ اور خیر سلا......

مگر میں اس لمحے واقعی بہت ڈر گئی تھی۔ اور اکثر مجھے اس بات کا خوف رہتا کہ امی خواب میں دیکھ نہ لیں......

!وہ کہتے ہیں نا

لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

ہاں کبھی کبھی بغاوت کرتے ہوئے خوابوں خیالوں کے اس جبر سے نکل جایا کرتی تھی مگر موجودہ واقعے نے تو میری ہنستی مسکراتی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔

میری دوستوں کا مشورہ تھا کہ مجھے اپنے بھائی کو نہیں بتانا چاہیے۔

میں اور خاور ہفتے کو کبھی کبھی اپنے رشتے داروں کے ہاں چلے جایا کرتی تھیں۔ میرے ددھیال والے گلبرگ میں رہتے تھے اور اتفاق سے تھوڑے ہی فاصلے پر خاور کی خالہ رہتی تھیں۔ ہمارا معمول تھا ہم بس سے اترتیں تو میں پہلے خاور کو گھر چھوڑتی کیونکہ وہ بہت ڈرپوک تھی اسے اکیلے چند قدم چلتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا اور اس کے بعد میں اپنے گھر چلی جاتی۔ میں نے خاور کو گھر چھوڑا اور اپنے گھر جانے کے لیے مڑی تو وہ لڑکا میرے ساتھ ساتھ چلتا ہوا میرے گھر تک پہنچ گیا۔

اف خدایا اس نے تو میرا گھر بھی دیکھ لیا تھا۔ اس لڑکے کا حوصلہ اتنا بڑھ چکا تھا کہ اس کو میرا رول نمبر بھی معلوم تھا اور میرے کمرے کا نمبر بھی......

وہ فون کرتا اور کہتا فلاں نمبر کمرے سے فلاں کو بلاؤ۔

میں گلبرگ سے واپس آئی تو نماز پڑھ کر بہت روئی......میں نے اللہ سے مدد مانگی اور کہا یا خدا اس میں میرا کیا قصور ہے اگر میرے گھر والوں کو معلوم ہو گیا تو سزا تو مجھے ہی ملے گی اور میں بے قصور

ماری جاؤں گی۔

اللہ نے میری مدد فرمادی اور میں نے اطمینان سے فیصلہ کیا اور اپنے بھائی کو ساری بات بتادی۔

بھائی کو جب پتہ چلا تو وہ بہت پریشان ہوا......

مگر...... میں اس دن سکھ کی نیند سوئی۔

بھائی نے کچھ دنوں تک خاموشی سے جائزہ لیا اور پھر ایک دن مجھے کہا تم اتنی بہادر بنی پھرتی ہو کسی دن کھڑی ہو کر پوچھ لو تم اس طرح کیوں کرتے ہو اور ویسے بھی تم جمعیت کی عہدیدار ہو جمعیت والوں سے بات کرو...... بھائی کے دیئے ہوئے حوصلے اور ہمت نے مجھے وہ طاقت دی کہ میرا سارا خوف جاتا رہا......

میں نے ایک دن ہمت کر کے اس سے پوچھ ہی لیا۔

میرا پیچھا کیوں کرتے ہو؟

آخر کیا چاہتے ہو؟

اس نے بھی اسی تحمل حوصلے اور بہادری سے وہ کہا جو وہ کہنا چاہتا تھا۔

میں خاموش ہو کر آگے بڑھ گئی۔

اس کے بعد میں جمعیت کی میٹنگ میں گئی تو میں نے یہ قصہ ان کے گوش گزار کر دیا۔

چونکہ یونین کی عہدیدار تھی اور انھوں نے مجھے یونیورسٹی میں ہونے والے الیکشن کے لیے بھی چن لیا تھا۔ سو اس بات کو بہت ہی سیریس لیا گیا۔

اگلے دن ایک لڑکے کی ڈیوٹی لگ گئی کہ وہ ایک ہفتے تک ہمارے ساتھ سفر کر کے اس واقعے کا عینی شاہد کے طور پر جائزہ لے گا اور پھر کارروائی کی جائے گی۔

مجھے جمعیت کے اس لڑکے سے متعارف کروایا گیا اور کہا گیا کہ پہلے دن آنکھ کے اشارے سے پیچھا کرنے والے لڑکے کی نشاندہی کروں۔ سو میں نے ایسا ہی کیا۔

ایک ہفتہ گزرا تو مجھے رپورٹ ملی کہ جمعیت والوں نے اسے پکڑ کر نہر میں ڈبو ڈبو کر مارا پیٹا......

بعد میں میرے بھائی نے بھی بتایا کہ جمعیت والوں نے اسے اتنا ڈرایا کہ وہ دوبارہ کبھی

اپنے ڈیپارٹمنٹ میں بھی نظر نہیں آیا......وہ شاید یونیورسٹی ہی چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

بھورے بال گوری رنگت نیلی آنکھیں۔

لمبا قد......

آہ بے چارہ......

ناکام عاشق۔

میرے اور نگہت کے کمرے کے ساتھ ایک سینئر لڑکی کیوبیکل میں رہتی تھی......وہ کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کی تھی۔ اس کے بارے میں کچھ عجیب وغریب و باتیں تو میں سنتی رہتی تھی۔ مجھے اسے جاننے کی جستجو ہوئی تو میری دوستی ہی ہوگئی۔

وہ کلاسیکل رقص کرتی تھی اور آج کل کتھک سیکھ رہی تھی۔

ہماری دوستی بڑھتی گئی اس نے پڑھائی کے ساتھ ساتھ ایک مختلف شوق پالا ہوا تھا۔ وہ ناک کی سیدھ پر چلنے والی لڑکیوں سے بہت مختلف تھی۔ بہادر تھی۔ سوسائٹی سے لڑنا جانتی تھی۔ اپنے شوق کو پروان چڑھانے کے لیے اسے کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ منافق نہیں تھی۔ اسے اس کی بھی کوئی فکر نہیں تھی کہ اسے کوئی کیا سمجھتا ہے۔ اور اس کے بارے میں کیا کیا باتیں کرتا ہے۔

مجھے وہ بہت اچھی لگتی تھی میری دوستوں کو میرا اس سے ملنا بہت کھلتا تھا۔ ان کے نزدیک وہ ایک بُری لڑکی تھی۔ اس کا ماحول بُرا تھا وہ ناچتی تھی۔ گاتی تھی......اس کا ایک شریف فیملی کے لڑکے کے ساتھ عشق کا بھی بہت چرچا تھا جو اکثر اسے ہوسٹل سے ڈیٹ پر لے جاتا اور پھر وہ کئی گھنٹے اس کے ساتھ گزار کر آتی۔ یہ سب باتیں میں نے اس سے دوستی سے پہلے سنی ہوئی تھیں۔ دوستی کے بعد اس نے مجھے خود بھی بتائیں اور یہ بھی بتایا کہ ایک دن اس کے دوست کے گھر والوں نے اسے مجھ سے ملنے پر پابندی لگا دی تو میں دھڑلے سے اس کے گھر پہنچ گئی۔ اور انھیں کہا کہاں ہے وہ نکالو اسے......سارے گھر والے تھر تھر کانپنے لگے اور بالآخر اس کے بڑے بھائی نے کہا ہم اس کی تم سے شادی نہیں کر سکتے کیونکہ تمھارے اور ہمارے ماحول میں بہت فرق ہے البتہ تمھیں ملوا دیتے ہیں......میں اور زیب دیر تک اس واقعے پر ہنستی رہیں۔ وہ دونوں گھر والوں کے خوف سے ملتے تو رہتے تھے مگر اتنی ہمت نہیں تھی کہ شادی کر لیتے......

ایک دن مجھے اپنے ایک قریبی رشتے دار کی شادی پر جانا تھا۔ وہ امی کے کزن تھے بہت پڑھی لکھی اور صاحب حیثیت فیملی جو سخت پردے کی پابند اور کٹر مذہبی تھی۔ ان کا سب سے چھوٹا بیٹا اعلیٰ تعلیم یافتہ تو تھا ہی مگر فنون لطیفہ کا بھی رسیا تھا۔

اس کی شادی کے لیے مجھے ہوسٹل سے لے لیا گیا اور پھر ہوسٹل میں ہی چھوڑ دیا گیا۔

شادی سے واپس آ کر میں زیب کے پاس چلی گئی......وہ بہت اداس اور مایوس سی بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگی آؤ نعیم اکٹھے چائے پیتے ہیں۔

کہاں گئی تھی؟ اس نے میرے شادی والے کپڑے دیکھ کر مجھ سے پوچھا...... میں نے بتایا ایک عزیز کی شادی پر گئی تھی کہنے لگی کہاں؟

میں نے کہا کرشن نگر

اس نے پوچھا کس کے گھر؟

میں نے بتایا اپنے ماموں کے گھر

وہ تڑپ اٹھی کہنے لگی وہی تو ہے جس کے قصے میں تمھیں سنایا کرتی تھی۔ وہ مجھے کئی دفعہ لینے آیا تم نے دیکھا نہیں۔ ابھی چند دن ہی ہوئے تھے تم میرے کمرے میں آئی تھی تو میں کپڑے استری کر رہی تھی۔ اس دن اسی کے ساتھ ہی تو جا رہی تھی۔

پھر اس نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا ہاں یاد آیا اس نے مجھے کہا تھا کہ یہاں میری ایک رشتے دار رہتی ہے کہیں وہ مجھے پہچان نہ لے......اور پھر وہ اپنے ناکام عشق کے قصے سناتی رہی روتی رہی اور میں سنتی رہی۔

ابھی راہ میں کئی موڑ ہیں کوئی آئے گا کوئی جائے گا

زیب کی داستان عشق سننے اور سنانے کے بعد ہمیں لگا ہماری دوستی اور مضبوط ہوگئی۔ میری دوستوں کو یہ دوستی ایک آنکھ نہ بھاتی اور وہ مجھے مسلسل روکتی اور ٹوکتی رہتیں۔

ایک دن زیب نے مجھے کہا نعیم تم کلاسیکل ڈانس کے لیے بہت موزوں ہو تمھیں شوق بھی ہے تم کیوں نہیں سیکھتیں۔ شام کی کلاسز میں میرے ساتھ چلا کرو کیمپس کی بس میں جایا کریں گے اور اسی بس میں ہی واپس آجایا کریں گے۔ رات بھر سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں کتھک ضرور سیکھوں گی۔ دوست کا ساتھ بھی ہے کیمپس کی بس میں چلی جایا کروں گی اور کیمپس کی بس میں ہی واپس آجایا کروں گی...... دوستوں نے پوچھا تو کہوں گی لائبریری گئی تھی۔

زیب سے یہ بات کسی طرح نگہت ڈار تک پہنچی۔ وہاں سے خاور تک ان سب نے مجھے ''بچانے'' کا پروگرام بنایا اور خاور نے میرے بھائی کو بتا دیا۔ ''اڑنے بھی نہ پائے تھے کہ گرفتار ہوئے ہم۔''

بس پھر کیا تھا میرا بھائی ہانپتا کانپتا ہوا آیا اور کہا تمھاری آج کل زیب کے ساتھ بہت دوستی چل رہی ہے اور تم اس کے ساتھ ڈانس سیکھنے کے پروگرام بنا رہی ہو۔ یاد رکھو تم ایک دن بھی زیب کے ساتھ باہر نکلیں تو وہ دن کیمپس میں تمھارا آخری دن ہوگا۔

میرے رشتے داروں سے امی کو بھی پتہ چل گیا کہ میری زیب کے ساتھ دوستی ہے کیونکہ زیب ہماری فیملی میں بہت مشہور تھی۔ وہاں سے بھی پیغامات موصول ہونے شروع ہوگئے کہ زیب سے مت ملو اور پھر آہستہ آہستہ میں زیب سے دور ہوگئی۔ جب کہیں اس کی کسی محفل میں کتھک پرفارمنس ہوتی مجھے ضرور بلاتی۔

بعد میں جب مجھے پتہ چلا کہ یہ سب خاور کی شرارت تھی تو میں اکثر اسے کہتی تم کیسی ظالم دوست ہو اللہ کو کیا منہ دکھاؤ گی مجھے تم نے کسی تجربے سے نہیں گزرنے دیا حتیٰ کہ کتھک ڈانس بھی سیکھنے نہیں دیا۔

تو وہ مجھے کہتی دیکھنا اسی بات پر سیدھی جنت میں جاؤں گی کہ میں نے تم جیسی لڑکی کو راہ راست پر رکھا۔

تھرڈ ایئر کا آخری سمسٹر تھا اور ہم سب پڑھائی میں مصروف ہو گئے خاور بہت پڑھا کو تھی ہمیشہ کلاس میں سیکنڈ آتی تھی فرسٹ پوزیشن ہماری کلاس کا ایک لڑکا نوری لے جاتا تھا۔ بعد میں وہ اورینٹل کالج میں پڑھانے لگا اور ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ بھی بنا۔ اس کا پورا نام فخر الحق نوری تھا...... ایک دفعہ میں بہت دنوں بعد اس سے اورینٹل کالج ملنے گئی۔ چوکیدار سے کہا نوری صاحب ہیں تو وہ بہت حیران ہوا اور کمرے میں جا کر بتایا کوئی خاتون آئی ہے اور وہ کہہ رہی ہے نوری صاحب سے ملنا ہے۔ فخر الحق نوری کہنے لگا فوراً بھیجو یہ یقیناً میری کوئی کلاس فیلو ہی ہوگی جس نے مجھے اس نام سے بلایا ہے۔

کمرے میں گئی تو ساری مصروفیات کینسل کر کے بڑے ہی تپاک سے ملا اور سب کو بتایا کہ ان کو پورا پورا حق ہے مجھے نوری کہہ سکتیں ہیں۔ ڈھیروں کتابیں مجھے تحفتاً دیں اور خوش ہو کر رخصت کیا۔

اورینٹل کالج میں بہت سے نامی گرامی اساتذہ سے پڑھنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی جو ایک سمسٹر کے بعد ہی ریٹائر ہو گئے تھے۔ وہ کھلے دل سے نمبر دیتے تھے اور کسی بھی سٹوڈنٹ کو فیل نہیں کرتے تھے۔ ہمیشہ پی ایچ ڈی کی حوصلہ افزائی کرتے طلباء ان سے بہت خوش تھے ان کے کمرے میں طلباء اور خصوصاً طالبات کا مجمع لگا رہتا تھا۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ برآمدے میں جاتے ہوئے طالبعلموں سے پوچھتے تم پی ایچ ڈی کیوں نہیں کر لیتے وہ کہتے ابھی تو ہم نے ایم اے بھی نہیں کیا۔

جواب ملتا چھوڑو ایم اے ہوتا رہے گا تم پہلے پی ایچ ڈی کر لو۔

وہ ہر وقت طلباء کے لیے میسر ہوتے تھے اور ان سے باتیں کر کے خوش رہتے۔ ان کی اولاد نہیں

تھی مگر وہ اپنی بیوی سے عشق کرتے تھے ان کے عشق کی داستانیں زباں زد عام تھیں۔ ہمیں بہت اشتیاق تھا کہ اس خوش قسمت خاتون کا دیدار کریں جو معشوق کے درجے پر فائز ہے۔ ان کی بیگم لاہور کے کسی کالج میں پڑھاتی تھیں۔ ایک دن ہم سہیلیاں مل کر ان کے گھر بھی گئیں تھیں۔ ان کا گھر سمن آباد میں تھا۔ ان کی بیگم واقعی بہت حسین عورت تھی اور اس پر محبوبہ ہونے کا حسن اور نکھار اپنی جگہ......

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی سے بھی کچھ عرصہ پڑھا، بڑے مزے سے اقبالیات پڑھاتے تھے اور جب وہ پڑھاتے تو کلاس روم میں کوئی مکھی بھی پَر نہ مار سکتی۔ اقبال سے عشق محبت اور محبت کا والہانہ پن دیکھنے کے لائق ہوتا۔

ایک دفعہ اسی طرح اقبالیات پڑھا رہے تھے۔ سٹوڈنٹ عقیدت کے سمندر میں صدیقی صاحب کی طرح غوطہ زن نہ ہو سکے پیچھے سے ایک لڑکے نے گرہ لگائی۔ سر سنا ہے اقبال گورنمنٹ کالج میں اپنے ہوسٹل کی کھڑکی سے کود کر شاہی محلے جایا کرتے تھے۔ کلاس میں سناٹا چھا گیا۔ صدیقی صاحب اس لڑکے کو مارنے کے لیے دوڑے اس نے بھاگ کر جان بچائی۔ اس کا نام اظہار شمسی تھا اور بعد میں وہ بھی درس وتدریس سے وابستہ رہا، شاعر بھی تھا۔ جمعیت کے ساتھ بھی وابستہ تھا اور بعد میں ہماری کلاس فیلو دیبا کے ساتھ عشق میں ایسا گرفتار ہوا کہ وہی اس کی وجہ شہرت بن گئی۔ جہاں بھی جاتا لوگ نعرے لگاتے ......دی......با......دی......با

شمسی ہاتھ نہ آیا تو صدیقی صاحب ناراض ہو کر کلاس روم سے نکل گئے اور کئی دن تک ناراض رہے اور یہی کہتے رہے میں اس بدتمیز اور گستاخ کلاس کو نہیں پڑھاؤں گا مگر پھر سٹوڈنٹ کے معافی مانگنے پر معاف کر دیا۔

ڈاکٹر عبیداللہ قد چھوٹا مگر بڑی ہی وضع دار سی شخصیت تھے، سائیکل پر آتے تھے۔ لڑکیوں کے لیے بڑا ہی نرم گوشہ رکھتے تھے۔ وضع قطع سے مولوی لگتے تھے مگر تھے پکے سرخے۔

کہا کرتے تھے نعیم علوی مزاج اور طور طریقوں کے اعتبار سے تو بائیں بازو کی ہے مگر دائیں بازو کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس کا اظہار وہ اکثر کلاس میں پڑھاتے ہوئے بھی کر دیا کرتے تھے۔ مجھے بہت قائل کرتے رہتے تھے کہ میں جمعیت چھوڑ دوں......مگر میں ہمیشہ ہنس کے ٹال دیا کرتی تھی۔

اکثر پڑھاتے ہوئے کوئی ادھورا شعر سناتے اور دوسرا مصرعہ یہ کہہ کر نہیں سناتے تھے کہ دوسرا مصرعہ لڑکیوں کی موجودگی میں سنانے والا نہیں اور ہم کلاس ختم ہوتے ہی دوسرا مصرعہ ڈھونڈنے کے لیے لائبریری کی طرف بھاگتے۔ وہاں جا کر پتہ چلتا ہم سے پہلے بھی کچھ لوگ موجود ہیں۔

ڈاکٹر سہیل زیادہ تر نوٹس لکھوایا کرتے تھے۔ اتنے لمبے نوٹس لکھواتے تھے کہ ہاتھ درد کرنے لگ جاتے۔

ڈاکٹر وحید قریشی ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ بھی تھے وہ ہمیں تنقید پڑھاتے تھے۔ انھیں فوٹو گرافی کا بہت شوق تھا۔ فوٹو گرافی کرتے ہوئے ان کا پیٹ ایک طرف رہ جاتا اور وہ منظر کی عکس بندی کے لیے اپنے بھاری بھر کم جسم کو ادھر ادھر ہلاتے ہوئے بڑی بڑی مشکل میں گرفتار ہو جاتے۔ ہم ان کی یہ کیفیت دیکھ کر دیر تک ہنستے رہتے۔ کبھی کبھار ہی کلاس میں آتے اور تنقید کے مشکل نکات سمجھا کر چلے جاتے اور ہم ہفتہ بھر اسی اکلوتے لیکچر کو سمجھنے میں گزار دیتے۔ ڈاکٹر زکریا صاحب سے ہم نے شاعری کو سمجھنا سیکھا اقبالیات کا مضمون بھی پڑھا مجید امجد پر انھیں تخصیص حاصل تھی۔

اورینٹل کالج کی کون کون سی یادیں سمیٹوں...... ہمارا تو ہر دن ایک نیا دن ہوتا تھا...... اولڈ کیمپس کی عمارت راؤنڈ میں تھی جس کے بیچ میں لان تھا۔

لان میں بیٹھے لڑکے اور لڑکیاں جن کی آنکھیں روشن، جذبے جوان، نگاہوں میں تلاش...... جستجو اور کچھ پا لینے کی آرزو...... اور پا لینے کے لیے خواہشوں کا لامتناہی سلسلہ......

ایک کامیاب اور مشہور خاتون ادیبہ نے کہا...... ''نہ جانے میں کون سی زندگی گزارتی رہی...... میری زندگی میں کبھی وہ لمحہ آیا ہی نہیں...... کہ کوئی مجھے گلاب کا پھول پیش کرتا اور میں کہتی...... آگے بڑھ کر بالوں میں لگا دو۔''

زندگی کو فرحت بخشنے کے تمام جائز اصولوں کو بھی ہم گناہ کے دائرے میں لا کر پہلے سنگسار کرتے ہیں اور پھر دفنا دیتے ہیں۔

اس لان میں ساتھ بیٹھنے ہنسی مذاق کرتے قہقہے لگانے والوں پر ہم طرح طرح کے الزامات

لگایا کرتے تھے...... کہاوت ہے نا! ''ہاتھ نہ پہنچے تھو کوڑی''

یہیں ایک خوبصورت آواز گونجا کرتی تھی۔

''سہانی چاندنی راتیں مجھے سونے نہیں دیتیں...... تمہارے پیار کی باتیں مجھے سونے نہیں دیتیں''

اسی لان میں اظہار سمشی اور دیبا کی داستان عشق نے کئی کروٹیں لیں......

اسی لان میں عائشہ اسلم کے قہقہے گونجا کرتے تھے۔

اسی لان میں ایک والد نے اپنے بیٹے کو سگریٹ پیتا دیکھ کر جوتے مارے تھے اور پھر دوستوں کی مزاحمت سے بمشکل چھوڑا تھا......

اسی لان میں محبت کی بے شمار داستانیں شروع ہوئیں...... کئی کامیاب کئی ناکام کئی سسکتی رہیں اور کئی سرخرو ہوئیں۔

ہمارا ایک مضبوط گروپ تھا...... سب اپنی اپنی حدود میں قید...... سب خوامخواہ ہی ایک دوسرے کے رکھوالے

''مان نہ مان میں تیرا مہمان''......

ہم لان میں بیٹھ کر ٹھٹھا کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔ سو یہاں بیٹھنے والوں کے بارے میں خوب باتیں کرتے...... ان کا مذاق اڑاتے اور بلا وجہ ان پر نظر رکھ کر اپنے آپ کو پاکبازی کی سند فاخرہ سے نوازتے رہتے۔

اسی لان میں قائم نقوی بھی آ کر بیٹھا کرتے تھے جن پر ہماری ایک کلاس فیلو بری طرح عاشق تھی۔ اسی لان میں عباس نجمی جو بعد میں ٹی وی اینکر بھی رہا اور عین شباب میں ہی دنیا سے چلا گیا...... اونچا لمبا جوان پنجابی ڈیپارٹمنٹ کا تھا اور بہت شوخ اور مجلسی شخصیت تھی۔ وہ ہمارے گروپ میں میری ایک دوست پنجابی جٹی میں دلچسپی لیتا تھا اور کوئی نہ کوئی شرارت ہمیشہ اس کے چہرے پر رہتی تھی۔ ایک دفعہ ایک ون ڈے ٹرپ میں ہم نے سب سے کہہ دیا کہ ہماری تصویر کوئی نہ بنائے اور اگر کوئی تصویر بنانے کی کوشش کرتا تو ہم اسے ڈانٹ دیتے خاص طور پر ہم عباس نجمی کے گروپ کے بارے میں بہت محتاط تھے...... وہ گروپ پورا دن ہمارے گروپ سے لاتعلق اور دور

دور رہا......ہم نے بھی مطمئن ہو کر خوب مزے کیے......

ٹرپ کے بعد ایک دن میں اور میری جٹی دوست کھڑی تھیں کہ عباس نجمی آیا......شرارت اس کے چہرے پر رقصاں تھی۔ایک لفافہ ہمیں دے کر کہا یہ آپ کی امانت میرے پاس تھی۔

ہم نے لفافہ کھول کر دیکھا تو اس میں ہماری ایسی ایسی تصویریں تھیں کہ ہم حیران رہ گئے کہ انتہائی محتاط رہنے کے باوجود اس نے کیسے بنا لیں...... بظاہر تو ہم نے ناراضگی کا اظہار کیا مگر تنہا بیٹھ کر ہم بہت ہنسے......ہم نے سوچا کہ جو بھی کر لو شرارتی لڑکوں سے بچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

ایک دفعہ ایک مشاعرہ ہو رہا تھا عباس نجمی اس کی کمپیئرنگ کر رہا تھا......ہم گھومتی گھماتی ادھر گئیں تو چپکے سے پچھلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئیں۔عباس نجمی کی نظر سے بھلا کیسے چھپ سکتی تھیں......وہ اسٹیج پر آیا اور اناؤنس کر دیا ابھی ابھی نعیم فاطمہ علوی تشریف لائی ہیں ہم انھیں خوش آمدید کہتے ہوئے ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنا کلام سنائیں......تالیاں......

میں اس حملے کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھی لہٰذا تالیوں کی گونج میں پیچھے سے ہی بھاگ گئی......

اورینٹل کالج میں اردو، پنجابی اور عربی زبان کے ڈیپارٹمنٹ تھے۔اِسی کالج میں وزیر آغا کا اکلوتا بیٹا بھی ہمارا کالج فیلو تھا......اِسی کالج میں فرحت ہاشمی اور ادریس بھی ہمارے ساتھ تھے۔

عربی ڈیپارٹمنٹ میں مصر سے آئے ہوئے ایک استاد بھی تھے گورے چٹے دراز قد عربی لباس میں بہت منفرد لگتے تھے۔ایک دن انھوں نے فرحت ہاشمی کو اپنے کمرے میں بلایا اور کہا میرا بیٹا بہت قابل ڈاکٹر ہے اور میں چاہتا ہوں کہ میں اس سلسلے میں تمہارے والدین سے ملوں...... مجھے آپ سے اجازت لینی ہے......فرحت سن کے باہر آ گئیں......میرے اور فرحت کے کلاس روم آمنے سامنے تھے۔ایک کلاس ختم ہوئی تو وہ میرے کلاس روم میں آئیں اور مجھے کہا نعیم کلاس ختم ہونے کے بعد مجھ سے ملو ضروری بات کرنی ہے......

ہم فارغ ہو کر برآمدے کی سیڑھیوں میں ہی بیٹھ گئیں۔اس نے مجھے یہ داستان سنائی تو میں نے کہا واہ جی واہ......فرحت ان کی بات مان لو کیا گورے چٹے بچے ہوں گے تمہارے اور موصوف

بھی تو والد ہی کی طرح کا ہوگا...... کافی دیر تک ہم باتیں کر کے ہنستی رہیں...... پھر اچانک وہ بہت سنجیدہ ہوگئیں اور کہنے لگیں...... نعیم میں سوچ رہی ہوں انکار کر دوں۔ میں نے کہا کیوں بھئی...... ابھی سوچ لو...... اس توقف کے بعد کہا...... نعیم میں کچھ اور طرح سوچتی ہوں میں ملک سے باہر نہیں جانا چاہتی ملک میں رہ کر ہی سوسائٹی کے لیے بہت کام کرنا چاہتی ہوں۔ باہر چلی گئی تو پاکستان سے کٹ جاؤں گی۔ اس کے خواب بہت صاف اور واضح تھے وہ ان میں ہی رنگ بھرنا چاہتی تھی۔ انھی میں ہی جینا چاہتی تھی۔ اس نے توقف کے بعد کہا۔

یونی ورسٹی کے بعد کا زمانہ

میری کزن فرحت تو یونیورسٹی سے ہی مظفر آباد چلی گئی اور وہاں جا کر کالج میں نوکری کر لی تھی......فرحت ہاشمی نگہت ڈار کافی دوستوں کو نوکریاں مل گئی تھیں۔ میں اور میرا بھائی اپنا بوریہ بستر اٹھا کر گھر چلے آئے......میرے والد کی ابھی سروس تھی اور وہ اپنی سرکاری رہائش گاہ میں رہتے تھے۔ ہمیں انھوں نے فیصل آباد والا گھر جو ابھی نیا بنا تھا وہاں شفٹ کر دیا۔ یونیورسٹی کی ہنگامہ پرور زندگی کے بعد کچھ دیر تو گھر میں رہنا بہت اچھا لگا۔

مگر میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں اپنے گھر میں اجنبی تھی میرا مزاج گھر کے ماحول سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ امی کا ذہن اگر مشرق کی طرف چلتا تھا تو میرا مغرب کی طرف......طرفین کے اس بُعد کو ہم دونوں کے لیے ہی پاٹنا بہت مشکل تھا۔ ہمارے گھر میں پشت در پشت خواتین کو مردوں کے زیر اثر رکھا جاتا تھا۔ ان کے نزدیک یہی شرافت نجابت سمجھداری اور سعادت مندی کا معیار تھا۔ مجھ سے پہلے میری پھوپھیوں کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ خاندان والوں کا خیال تھا کہ اس طرح زمین تقسیم ہو کر غیروں میں چلی جائے گی۔ میری پھوپھیاں بلا مبالغہ انتہائی خوبصورت لمبے قد لمبے حسین بال سمجھدار سلیقہ شعار اور اخلاق و آداب میں کوئی ثانی نہیں رکھتی تھیں۔ مگر انھیں کبھی اجازت نہ تھی کہ دروازے سے جھانک کر باہر بھی دیکھ سکتیں۔ ایک پھوپھی تو بلا کی ذہین تھیں۔ میرے ابو کو تاریخ سے بہت دلچسپی تھی پھوپھو ان سے سن سن کر مغلیہ تاریخ کو اتنا جانتی تھیں کہ بعد میں مجھے بھی غلطی پر ٹوک دیا کرتی تھیں۔ یادداشت بھی بہت اعلیٰ تھی۔ گھر میں بھائیوں کی مدد سے اور کچھ تھوڑا بہت خود سے کوشش کر کے گھر میں ہی کتاب پڑھنے کے قابل ہو گئیں تھیں۔

میرے دادا نے منی مارکیٹ کے ساتھ ایم ایم عالم روڈ کے قریب چار کنال کا گھر بنایا تو

دونوں پھوپھیوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اردگرد کون رہتا ہے۔ ہمارے گھر کے سامنے ہی ملکہ ترنم نور جہاں نے بھی گھر بنایا وہ جب کہیں جاتیں اپنی بیٹی ظلِ ہما کو میری پھوپھیوں کے پاس چھوڑ جاتی۔ پھوپھیوں کو صرف یہ معلوم تھا کہ یہ خاتون سامنے والے گھر میں رہتی ہے۔اور ہماری ہمسائی ہے۔ بہت بعد میں کسی نے بتایا کہ یہ تو نور جہاں ہے جو گانے گاتی ہے۔

میری پھوپھیوں کے ہاتھ کی بنی دریاں سویٹر سلائی کڑھائی دیکھنے کے قابل تھی۔ان جیسا سلیقہ ان کی ہم عصر لڑکیوں میں دور دور کہیں نظر نہیں آتا تھا۔

اعوان خاندان کی پوری تاریخ ازبر تھی ایک دفعہ میں نے پوچھا آپ کو اتنی باتیں کیسے معلوم ہیں کہنے لگیں فلاں سنۂ میں تمھارے والد ایک کتاب لائے تھے اور انھوں نے وہ مجھے پڑھ کر سنائی تھی۔ پھوپھی عظمت تو انتہائی جینئس خاتون تھیں۔مگر مواقع نہ ملنے کی وجہ سے وہ کورا کاغذ ہی رہ گئیں۔

فیصل آباد والے گھر میں...... میں امی اور میرے دو بھائی رہتے تھے۔کبھی کبھی پھوپھیاں بھی رہنے کے لیے آ جاتیں۔ یہاں آ کر مجھے احساس ہوا کہ لڑکیوں کو شادی کے لیے رسم دکھاوا کی کن کن اذیتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

پہلے تو خواتین کو گھر میں کمتر درجہ پھر قبول یا رد کیے جانے کے رویوں سے گزرنے کا خوفناک مرحلہ۔کسی بھی کھونٹی سے بندھے جانے اور اجنبی مالک کی غلامی میں بخوشی دیے جانے کی رسم ذبیح......

گھر کے کاموں کو تو میں انگلیوں پر نچا کر منٹوں میں رام کر لیا کرتی تھی۔ صفائی کڑھائی سلائی کھانا پکانا......اس کے علاوہ میں فجر کی نماز کے بعد یوگا بھی کیا کرتی تھی۔ کتابیں بھی پڑھا کرتی تھی اور رات کو ریڈیو پر فرمائشی گانے بھی سنا کرتی تھی۔نٹنگ کا بھی چسکا تھا میں اگر جمعے کو مردانہ سویٹر شروع کرتی تو اگلے جمعے کو بنا کر اور سی کر پہنا دیا کرتی تھی کوئی بھی مشکل ڈیزائن میری دسترس سے باہر نہیں ہوتا تھا۔

امی میرے لیے سوٹ لاتیں اور میں اسے فوراً میز پر رکھتی کاٹتی اور ایک گھنٹے میں سی کر پہن لیا کرتی تھی......

اسی زمانے میں میں نے قرآن کا تفصیلی مطالعہ بھی کیا۔کئی قسم کے وظیفے بھی کیے استخارے کے تجربات سے بھی گزری۔

سفید کپڑے پہن کر کئی دن کا چلہ بھی کاٹا۔ میری امی میری ان مصروفیات سے بہت خوش ہوتی تھیں۔اور مجھے نئے نئے تجربوں سے گزرنے اور پھران کی سچائی معلوم کرنے کا بہت شوق تھا۔جس کام میں بھی گھس جاتی اس کے تہہ تک پہنچ کر دم لیتی۔ان سب چیزوں کے تجربے سے معلوم ہوا کہ یہ سب طفل تسلیاں ہی ہیں۔

بار ہا ذہن میں سوال اٹھتے کہ چندگنی چنی صورتیں ہی نماز میں کیوں پڑھی جاتی ہیں؟ باقی قرآن بھی پڑھنا چاہیے سو میں میز پر قرآن رکھتی ساتھ ہی نماز کی نیت کر لیتی اور قرآن کو دیکھ دیکھ کر پڑھتی رہتی جب رکوع ختم ہوتا سجدے میں چلی جاتی امی دیکھ کر کہتیں تمھاری نماز نہیں ہوئی......میں کہتی آپ کو کیسے معلوم ہے کہ آپ کی نماز ہوگئی...... بڑی ڈانٹ پڑتی......امی میرے کام کاج سے تو خوش تھیں مگر میرے مزاج سے بہت ناخوش......امی بڑے ہی اہتمام سے ختم دلواتی تھیں۔گیارہویں کا ختم تہواروں کا ختم نفلی روزے...... ہر مہینے ہی کوئی نہ کوئی عبادت کی گھڑی ہوتی جمعہ تو خاص اہتمام سے مناتی تھیں سب گھر والوں کا نہانا لازمی، عطر لگانا لازمی، جمعہ پڑھنا لازمی، پورے گھر کی صفائی لازمی تمام بستروں کی چادریں بھی بدلی جاتیں۔قبر میں روشنی کے لیے سورہ کہف بھی پڑھی جاتی صلاۃ التسبیح بھی ضرور پڑھی جاتی۔

غرض ہر جمعہ ہمارے گھر پورے تزک واحتشام سے منایا جاتا۔

میرے سوالات امی کو پریشان ضرور کرتے تھے لیکن وہ مجھ سے ساری عبادتیں پیار دلار سے کروالیتی تھیں۔

گھر میں آتے ہی کرفیو لگ چکا تھا۔میری سہیلیوں کا آنا امی کو ناگوار لگتا تھا۔امی کسی شادی بیاہ کے فنکشن پر بھی مجھے ساتھ نہیں لے کر جاتی تھیں۔لوگ کیا کہیں گے جوان بیٹی کو لیے پھر رہی ہے۔

ایک دن میں کچن کے باہر کھڑی تھی میرا بھائی امی کو سمجھا رہا تھا امی نعیم پر اتنی پابندیاں نہ لگایا کریں آپ کو نہیں معلوم یہ یونیورسٹی میں کیا چیز تھی۔

میرا بھائی نوکری کے لیے درخواستوں اور انٹرویوز کے مراحل سے گزر رہا تھا میری امی اس کے لیے جائے نماز پر بیٹھ کر دعاؤں میں مصروف رہتیں اور میں گھر کی موج مستی میں...... میرا بھائی کے ساتھ اچھا وقت گزر رہا تھا...... میری کزن فرحت نے مجھے کئی خط لکھے فون کیے کہ مجھ سے ملنے کے بہانے مظفر آباد آ جاؤ اور آ کر کالج جائن کر لینا یہاں نوکریوں کے بہت مواقع ہیں نئے نئے کالج کھل رہے ہیں۔

ایک دن امی سے فرحت کو ملنے کے لیے مظفر آباد جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے کہا...... فرحت تو آوارہ ہوگئی ہے۔ تمھیں بھی اس آوارگی کے لیے بھیج دوں...... امی کے نزدیک نوکری کرنا آوارگی تھی۔

نسل در نسل کچلے اور مسلے ہوئے خیالات میں پختگی آ جائے تو ان پیمانوں کو بدلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

انھی دنوں میرے بھائی کا کلاس فیلو اور میرا یونیورسٹی فیلو مظفر آباد سے میرے بھائی کے پاس آیا اور اس نے کہا اپنی بہن کو نوکری کی اجازت دے دو۔ مظفر آباد میں ہمارے کئی سکول کالج ہیں مگر میرے بھائی نے اسے منع کر دیا۔

کچھ ہی ہفتوں کے بعد میرے بھائی کو سول ایوی ایشن میں نوکری مل گئی اور وہ ٹریننگ کے لیے حیدر آباد چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد تو جیسے میری دنیا ہی اجڑ گئی۔ ہر کام سے بوریت ہونے لگی۔

ان دنوں میرے رشتے بھی آنے لگے تھے۔ میری امی کو کوئی بھی رشتہ پسند نہ آتا......

ایک لڑکا اپنی بوڑھی ماں کو روز ہمارے گھر کی دہلیز پر چھوڑ جاتا۔ وہ بے چاری امی کی منتیں کرتی رہتیں امی کو بہت برا لگتا کہ یہ روز میرے منع کرنے کے باوجود کیوں آ جاتی ہے۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کون ہے جو اس طرح اپنی ماں کی بے عزتی کرانے کے لیے بھیج دیتا ہے اور وہ خاتون بھی بڑی ہمت والی جو میری ماں کی جھڑکیاں کھانے آ جاتی تھیں۔ میں کئی دن یہ تماشا دیکھتی رہی ایک دن اس غیر انسانی سلوک پر بہت غصہ آیا اور میں نے اس خاتون کے آنے پر اسے ٹرے

میں رکھ کر بڑے اہتمام سے چائے پیش کی......وہ اس خاطر مدارت پر بہت خوش ہوئی...... بعد میں امی نے مجھے خوب ڈانٹا اور ایک دن اس خاتون کو کھری کھری سنا کر گیٹ سے ہی واپس کر دیا......

اب میں بہت ڈیپرس سی رہنے لگی تھی۔ مجھے کسی طرح معلوم ہوا کہ ہمارے گھر کے قریب ہی کوئی بہت اچھا اسکول کھلا ہے۔ میں نے بہت مشکل سے امی سے اجازت لے لی کہ مجھے وہاں انٹرویو دینے دیں......

امی میرے ڈیپریشن سے پریشان تو ہو گئی تھیں سوچا ہو گا چلو گھر کے قریب ہی ہے جانے دیتی ہوں۔ میں اپنے چھوٹے بھائی کو جو مجھ سے پانچ سال چھوٹا تھا۔ گھر میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے اسے ہم گھر کے فیصلوں میں کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ میں اس کے ساتھ اسکول میں انٹرویو دینے چلی گئی......

سٹاف روم میں بٹھا کر مجھے کہا گیا کہ اسکول کا مالک پرنسپل کسی کام سے باہر گیا ہے۔ وہ آئے گا تو انٹرویو لے گا۔ میں انتظار کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد پرنسپل آ گیا اور اس نے مجھے انٹرویو کے لیے اپنے آفس میں بلایا۔ میرا بھائی بھی میرے ساتھ ہی آفس میں آ گیا۔ ابھی میں کمرے میں داخل ہی ہوئی تھی کہ پرنسپل صاحب کرسی سے اچھل کر کھڑے ہو گئے ......اور مجھے دیکھ کر کہا......اوہ نعیم علوی آپ کی جگہ وہ نہیں یہ ہے۔

اور پھر وہ لڑکا پرنسپل کی کرسی پر نہ بیٹھا میرے ساتھ ہی آ کر بیٹھ گیا اور مجھے کہا میں بھی آپ کا یونیورسٹی فیلو ہوں، آپ کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ پرنسپل کے طور پر میرا اسکول سنبھالیں میرے تو اور بھی اسکول ہیں۔ میری یہ خوش قسمتی ہے کہ آپ میرے اسکول میں انٹرویو دینے آئی ہیں......اور تنخواہ بھی اپنی مرضی سے طے کریں......

میں اس پذیرائی پر بہت خوش ہوئی......اور بھول گئی کہ میرا بھائی بھی میرے ساتھ ہے۔ گھر پہنچی امی نے پوچھا انٹرویو کیسا ہوا تو میرا بھائی فوراً بولا......امّی باجی سے کہیں نوکری کا بھوت ذہن سے اتار دیں۔

اگر باجی نوکری کے لیے گھر سے باہر نکلیں تو میں ان کی ٹانگیں توڑ دوں گا......

یہ چھوٹا سا بھائی خود بخود ہی میرا محافظ بن گیا تھا۔اس سے پہلے اس نے کبھی میرے سامنے آنکھ اٹھا کر بات نہیں کی تھی۔ میں تو دیکھتی ہی رہ گئی۔اسکول کے مالک کی پذیرائی میرے لیے سزا بن گئی......اور میں پھر سے گھر میں محصور ہوگئی......

میرا اور میرے اس بھائی کا ماں بیٹے والا تعلق تھا......مگر اس وقت خاندانی عزت، غیرت، وقار سب ابل ابل کر اس کی آنکھوں سے باہر آ رہا تھا۔

اس کے بعد میں پھر خاموشی سے بیٹھ گئی...... مجھے یوں لگتا تھا زندگی کی تاریک راتوں پر سفر کر رہی ہوں۔میرے لیے اس ماحول سے فرار کا ایک ہی راستہ رہ گیا تھا۔اور وہ تھا شادی......

میرا بھائی مجھے حیدر آباد کی ٹریننگ کے نت نئے قصے سنایا کرتا اور میں سوچتی رہتی کہ آخر میرا قصور کیا ہے جو میرے لیے قانون اور ہیں۔میرے بھائی کے لیے اور...... میں ان روایات کو توڑنے کا اختیار کیوں نہیں رکھتی۔ میں اپنی زندگی کے فیصلے خود کیوں نہیں کر سکتی۔مجھے بھیڑ بکریوں کی طرح لوگوں کے سامنے کیوں پیش کیا جاتا ہے......لوگوں کو مجھے ردّ یا قبول کرنے کا اختیار کس نے دیا ہے......اس ظالمانہ رسم سے لڑکی کی انا کس کس طرح مجروح ہوتی ہے...... یہ اس لڑکی کے علاوہ اور کوئی نہیں جان سکتا......

ایک دن میں بہت غمزدہ تھی...... میں نے امی سے صاف صاف کہہ دیا یا تو مجھے نوکری کرنے دیں یا پھر میری شادی کر دیں میں اپنی زندگی اس شش و پنج میں نہیں گزار سکتی......

امی نے کہا کوئی ڈھنگ کا رشتہ ملے گا تو کروں گی۔

میں حالات کی گھٹن سے تنگ آ گئی تھی اور یوں لگتا تھا اپنے وقت کا ہر ہر لمحہ ضائع کر رہی ہوں۔

میں نے امی کو ترنت جواب دیا۔

آپ اس طرح کریں صبح اٹھیں دروازہ کھولیں گلی میں جو بھی لڑکا جا رہا ہو اس سے میری شادی کر دیں۔میں شکوہ نہیں کروں گی اور نہ ہی واپس پلٹ کر آؤں گی۔

امی سے اس طرح کی بات کر دینا کوئی معمولی بات نہیں تھی......

اُف! گھر میں تو ایسے جیسے زلزلہ آ گیا ہو..........سب کچھ تہس نہس ہو گیا.....امی نے شاید ابو کو بھی بتا دیا۔ دونوں پریشان ہو گئے اور مجھ سے کم کم بات کرنے لگے......

اسی دوران میری پھوپھیاں بھی رہنے کے لیے آ گئیں۔ انھوں نے بھی امی کو خوب سنائیں۔ خاندان کے کسی رشتے کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔ اب دیکھ لیں گے کون سا شہزادہ گلفام ڈھونڈ لیتی ہو۔

ان دونوں اوپر تلے کے واقعات سے امی کا لوگوں کو پرکھنے یا رد کرنے کا گراف کافی نیچے آ چکا تھا۔

انھی دنوں واقعی گھومتا پھرتا شہزادہ گلفام آ گیا۔ ایوب انھی دنوں انگلینڈ سے پی ایچ ڈی کر کے آئے تھے اور عام لڑکوں سے بہت زیادہ کما رہے تھے۔ کئی جوان لڑکیوں کے گھروں میں ان کا نام لیا جا رہا تھا۔

ایوب نے مانچسٹر سے پی ایچ ڈی کی اور وہیں نوکری بھی مل گئی۔ ان کے والد نے بھی گلاسکو سے انجینئرنگ کی تھی اور کراچی میں آواری ٹاور کی بلڈنگ بنا رہے تھے کہ اچانک ہارٹ اٹیک ہوا اور وفات پا گئے۔ نہ جانے مرنے سے کچھ دِن پہلے اُن کے دل میں کیا آئی کہ انھوں نے اپنے بڑے بیٹے ایوب کو انگلینڈ میں خط لکھا اور سمجھایا کہ میں دل کا مریض ہوں اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم ہی چھوٹے بہن بھائیوں کے ذمہ دار ہو۔

وہ خط ایوب کو اپنے ڈیڈی کی وفات کے بعد ملا۔ اس کے بعد جب جسٹس سید اخلاق حسین نے اپنی بیٹی نسیم زہرہ کے ساتھ ان کا انٹرویو کرنے کے بعد انھیں پاکستان میں نوکری کی آفر کی تو انھوں نے فوراً قبول کر لی۔

لہٰذا یہ لوگ ادھر ادھر گھومتے گھماتے ہمارے گھر آئے تو رشتے کی بات دونوں گھروں میں دلچسپی اور توجہ سے سنی اور سمجھی گئی۔ امی نے کہہ دیا کہ میرا بیٹا حیدر آباد سے آئے گا تو ہی فیصلہ ہو گا۔ بھائی آیا یہ لوگ ملے تو انھیں بھائی بھی بہت پسند آ گیا انھوں نے تجویز پیش کی کہ آپ نے بھی کل کلاں کو بیٹے کی شادی تو کرنی ہی ہے کیوں نہ ہم ایک کی بجائے دو رشتے کر لیں۔ میرے بھائی کو

معلوم ہوا تو وہ بہت چیخا کہ میں ابھی شادی کے لیے بالکل تیار نہیں ہوں۔...... مجھے ابھی نئی نئی نوکری ملی ہے لہٰذا میں کچھ عرصہ شادی نہیں کرنا چاہتا......امی کا ایک بھانجا جو اس رشتے کو کروانے میں بہت دلچسپی رکھتا تھا امی پر مسلسل پریشر ڈالتا رہا......

امی لڑکی دیکھنے گئیں تو جواب دے کر آ گئیں انھیں لڑکی بالکل پسند نہیں آئی۔ رشتہ ختم ہو گیا۔

پھر دوبارہ اس میں ہلچل مچی اللہ کو یہی منظور تھا حالات بھی ایسے بنتے چلے گئے اور بالآخر میرے بھائی کے رونے پیٹنے کے باوجود یہ رشتہ ہو گیا......میرے ابو بہت سادہ طبیعت تھے۔

چھوٹا بھائی گھر میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے بڑوں میں بولنے کا حق نہیں رکھتا تھا۔ بڑا حیدر آباد تھا۔ امی کو بڑی ہوشیاری سے دور شتوں کے لیے راضی کر لیا گیا۔

اور میں بے زبان محض تماشائی تھی......اور شب و روز کی یکسانیت اور سخت پابندیوں میں دم گھٹنے لگا تھا۔ دل چاہتا تھا کہیں سے تو تازہ ہوا کا جھونکا آئے۔

زندگی کا نیا موڑ

شادی طے ہوگئی تو ایوب کی طرف سے مختلف تجاویز آنے لگیں۔
ہم ایسا نہ کرلیں کہ ہم اپنی بیٹی لے کر آپ کے گھر آ جاتے ہیں۔
گھر کے قریب کسی مولوی کو بلائیں گے نکاح ہو جائے گا ہم اپنی بیٹی چھوڑ جائیں گے اور
آپ کی بیٹی کو لے جائیں گے۔
اور یہ بھی کہ نہ جہیز کا تبادلہ ہوگا نہ کوئی رشتے داروں کے کپڑوں کا جھنجھٹ ہوگا۔
آپ اپنے لڑکے کے کپڑے بنالیں ہم اپنے لڑکے کے بنالیں گے وغیرہ وغیرہ
ہمارے گھر میں کون تھا جو احتجاج کرتا ابو اپنی نوکری کے سلسلے میں گھر سے باہر...... بھائی
ناراض تھا اس نے کہہ دیا کہ مجھے تو چھٹی ہی نہیں ملتی میں شادی سے چند دن پہلے آ جاؤں گا۔
میرے والدین کو یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ عین ٹائم پر نہ آئے......
میری کزن فرحت کئی دن پہلے اپنی نوکری سے چھٹی لے کر میری دلجوئی کے لیے میرے گھر
آ چکی تھی۔
میری بہت پیاری دوستوں کا بھی آنا جانا لگا رہتا تھا۔ سب میری امی کی سخت طبیعت سے
واقف تھیں۔
شادی کے دنوں میں ہی اچانک میرے تایا کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ اس جہان فانی سے
رخصت ہوگئے۔ گھر میں سوگواری کی کیفیت میں اضافہ ہوگیا شادی کی تیاریوں میں ہی لوگ
افسوس کرنے بھی آتے رہے۔
فرحت آئی تو ہم نے سوچا شادی کے لیے کچھ کپڑے سلوانے چاہییں۔ ابھی تو شادی کا

جوڑا بھی نہیں سلا تھا...... میری سہیلیوں کی نشاندہی پر فیصل آباد کے ایک بہترین درزی کا انتخاب ہوا...... میں نے اور فرحت نے امی سے بہت کہا کہ ہم دونوں جا کر درزی کو سلنے کے لیے کپڑے دے آتے ہیں مگر میری امی کا خیال تھا کہ لڑکیوں کو اکیلے نہیں جانا چاہیے۔ سو ہمیں امی کے ساتھ ہی درزی کے پاس جانا پڑا۔

اس دکان کا درزی بھی ایک نوجوان لڑکا تھا۔ شادی کے کپڑے دیکھ کر وہ پورے طور پر ہماری طرف متوجہ ہو گیا ماپ لینے کے لیے اس نے کہا دوپٹہ اتار دیجیے کندھوں کا اور چیسٹ کا ماپ لینا ہے۔

پہلے تو دوپٹہ اتارنے کا مرحلہ۔۔دوسرا کندھوں کا ماپ......اور پھر جب اس نے ماپ لینے والی ٹیپ کو چیسٹ سے لگا کر ماپ لینا شروع کیا تو امی کا ضبط تمام بندھنوں سے آزاد ہو گیا......

بھرے بازار میں درزی کی دکان اور دکان کے اندر اور بھی کافی گاہک تھے۔

امی...... بے شرم بے غیرت اور بے حیا کے شریفانہ الفاظ سے شروع ہوئیں......اور انتہائی غیر مہذب الفاظ سے ہوتی ہوئیں نہ جانے کہاں تک پہنچ جاتیں......

دکاندار نے فوری طور پر کپڑے لیے اور کہہ دیا فکر نہ کریں میں بالکل صحیح بنادوں گا اور ہم نے بھی کپڑے پھینک کر دکان سے باہر دوڑ لگا دی......ہم دونوں آگے آگے اور امی ہم سے دو فرلانگ پیچھے چل رہی تھیں مگر ان کی مدھ بھری آواز میں سریلے نغموں کی پھوار مسلسل ہمارا پیچھا کر رہی تھی۔اس زمانے میں بیوٹی پارلر ایجاد ہو چکے تھے مگر میری امی تک اس کی اطلاع نہیں پہنچی تھی۔ چوڑیاں مہندی ہار سنگھار پھول پھلواری کی دکانیں فیصل آباد میں ہوں گی مگر ہمیں ان سے کیا لینا دینا......

ہم نے اس کسمپرسی کے حالات میں بھی شادی کے تمام انتظامات خوش اسلوبی سے سرانجام دیے۔

آنے والی بھابی کا ''دلہن کا کمرہ'' تیار کیا۔ گھر میں رہنے والے مہمانوں کے سونے کھانے سے لے کر تمام لین دین کے انتظامات ہو چکے تھے۔ حتیٰ کہ میں نے امی اور بھائیوں کے تمام دنوں کے کپڑے بھی تیار کر کے الماری میں لٹکا دیے تھے تا کہ امی کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے......

شادی کے دن بارات وقت مقررہ سے پہلے ہی پہنچ گئی۔ میری سہیلیوں نے بہت مذاق اڑایا لگتا ہے مولانا صاحب نے تہجد پڑھتے ہی سفر شروع کر دیا...... بارات آئی تو سب لوگ بارات دیکھنے کے لیے چلے گئے میری خاص سہیلیاں میرے پاس تھیں وہ مجھے میرے منع کرنے کے باوجود کھینچ کر کھڑکی کے پاس لے گئیں اور کہا دولہے کی ایک جھلک تو دیکھ لو......

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو چھوٹی چھوٹی داڑھی درمیانے قد اور صاف رنگت والا ہنستا مسکراتا لڑکا گلاب کے پھولوں کا ہار پہنے کھڑا تھا۔

دولہا خاصا باوقار سلجھا ہوا، متین اور متاثر کن شخصیت کا مالک تھا

مگر میرے دل کی بھٹی میں جذبات مکئی کے گیلے دانوں کی طرح تھے جو چپ چاپ تپتی ریت میں ہلاتے رہنے سے ادھر ادھر تو ہو جاتے ہیں مگر کھڑ کھڑ کر کے اچھل کود کرتے آپے سے باہر نہیں ہوتے۔

شادی کے دن حسبِ رواج میری پھوپھو اور میری کزن فرحت کا میرے ساتھ میرے سسرال جانا طے ہوا......

گاڑی میں ہم تینوں پیچھے...... دولہا اور دولہے کا بھائی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

سفر بخیر اس طرح گزرا کہ نہ تو اگلی سیٹ سے کوئی آواز آئی اور نہ ہی پچھلی سیٹ سے کوئی پکار ہوئی۔

لاہور پہنچے تو گاڑی ایک گیٹ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ دولہا گھر کے اندر داخل ہو گیا دولہے کا بھائی پچھلے مسافروں کے گاڑی سے نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر گاڑی میں اور کچھ دیر گاڑی کے باہر انتظار کرنے کے بعد جب گھر کے اندر سے کوئی بھی نہ نکلا تو ہم تینوں آہستہ آہستہ چلنا شروع ہو گئے۔ اتنے میں ایک مہمان خاتون گھر سے نکلی اور ہم اس کی رہنمائی میں گھر کے اندر داخل ہو گئے اور ہمیں ڈرائنگ روم میں بچھے بیڈ پر بٹھا دیا گیا۔

یوں لگتا تھا اس گھر میں کسی عورت کا کوئی وجود ہی نہیں۔

کچھ دیر بعد میری بڑی نند آئی اور کھانے کی ٹرے ہمارے پاس رکھ کر چلی گئی۔ ہم نے کھانا

کھایا اور سوچتے رہے کہ شاید کوئی چائے کا پوچھنے آئے۔ شاید کوئی برتن لینے آئے۔

جب کافی دیر تک کسی ذی شعور کی جھلک تک نہ دیکھی تو پھوپھو اور فرحت جنھیں تھکن کی وجہ سے چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ انھوں، نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا اور بتایا کہ مجھے سانس کی تکلیف ہے اس لیے چائے پلا دیجیے......

دن کی روشنی میں میری منجھلی نند کمرے میں داخل ہوگئی اور گیٹ کے سامنے کھلنے والی کھڑکی کے پردے ہٹا گئی۔ گیٹ سے لوگوں کی آمدورفت سے مجھے کوفت ہو رہی تھی۔ میں نے فرحت سے کہا پردے پھیلا دو مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے ہم بازار میں بیٹھے ہیں۔ فرحت نے پھر سے پردے پھیلا دیے۔۔۔ یہ کمرہ اس گھر کا ڈرائینگ روم تھا......جس کی کھڑکی گیٹ کے بالکل سامنے تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہی نند دوبارہ آئی اس کے ہاتھ میں آتشی گلابی رنگ کا غرارہ تھا بیڈ پر پھینکتے ہوئے کہا یہ نعیم کو پہنا کر وقت پر تیار کر دینا......اور سنو لپ اسٹک میچنگ لگانا......

ساتھ ہی اس نے پھیلے ہوئے پردے دیکھے تو بڑی ہی سرد مہری سے کہا یہ پردے کس نے پھیلائے ہیں۔ فرحت نے کہا نعیم کہہ رہی ہے لوگوں کی آمدورفت سے بے پردگی کا احساس ہوتا ہے اس نے غصے سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا اس گھر میں آ گئی ہو تو اس گھر کے افراد کو بھی اپنا ہی سمجھو یہاں کسی غیر کا آنا جانا نہیں......

ہم خاموش ہو گئے ......تھوڑی دیر بعد میری ساس آئی انھوں نے ایک مالا دو کڑے ایک سیٹ بالیوں کا مجھے دیا اور کچھ دیر ہمارے پاس بھی بیٹھی رہیں۔

فرحت کو غصہ آیا ہوا تھا کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں جو مہمانداری تو دور کی بات یہ تو کسی قسم کی اخلاقیات سے بھی واقف نہیں ہیں۔

اب کی بار اُسی نند نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بڑی نخوت سے کہا میچنگ لپ اسٹک کیوں نہیں لگائی۔

فرحت نے جواب دیا غرارہ لیا تھا تو میچنگ لپ اسٹک بھی لے لی ہوتی......

اسی حالت میں ہمیں گاڑی میں بٹھا دیا گیا اور پھر گاڑی سے اتار کر اسٹیج پر لے گئے۔
برائیڈل روم میں آج کی دلہن تیار ہو رہی تھی۔ جسے ہم نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔
بڑے اہتمام سے تصویریں کھینچی گئیں۔ میری چھوٹی نند گھر والوں سے ناراض تھی وہ پرانا لون کا سوٹ پہن کر شادی میں شریک ہوئی۔
حیرت کی بات یہ تھی کہ نجانے کیا غلطی ہوئی اس تقریب کی کوئی تصویر کسی کیمرے میں محفوظ نہ ہو سکی۔

پیلی جیکٹ

کھلے گیٹ کو ہلکا سا دھکا دیا تو گیٹ کھل گیا۔ پیلی جیکٹ پہنے ایک شخص اندر داخل ہوا نہ دستانے نہ ماسک چھم چھم برستی بارش میں گھر کا کوڑا اٹھایا اور ریڑھی میں ڈال کر چل دیا۔ آج میرے دل میں پہلی دفعہ اس کے لیے بے حد احترام کا جذبہ پیدا ہوا۔ یہ شخص جان پر کھیل کر مجھے کن کن جراثیموں سے بچا گیا۔ میرا صاف شفاف گھر اسی کے دم سے ہے۔ یہ بھی تو قوم کا سپاہی ہے آؤ مل کر اسے سلیوٹ کریں۔ گھر کے ڈرائینگ روم میں گلی کے طرف کھلتی ہوئی قد آدم شیشے کی کھڑکی اس لیے بنوائی تھی کہ گھر میں روشنی آتی رہے مگر آج کل یہ ہمارا مستقل مسکن ہے۔

گلی میں جھانکتے ہوئے سوچ رہی ہوں بارش چھم چھم برس رہی ہے۔ پورچ کی چھت کے کونے سے صاف شفاف پانی موتیوں کی لڑیوں کی طرح ٹپک رہا ہے۔ درخت لہلہا رہے ہیں، پھول کھلے ہوئے ہیں، گھر پرآسائش ہیں۔ مکانوں کی آرائش وزیبائش بھی قائم ودائم ہے، موسم بھی خوشگوار ہے، بجلی پانی گیس کی بھی فراوانی ہے۔

مگران گلیوں میں چلتے پھرتے دوڑتے انسانوں کو کیا ہوا......

کائنات کو مسخر کرنے والا انسان اسی کائنات میں چھپتا پھر رہا ہے۔

کیا یہ روزِ حشر کا سا ساماں نہیں......

مہربان کیسے کیسے

کھڑکی کے اس پار......

میرے کمرے کی کھڑکی سے باہر لوکاٹ کے گچھوں کو بارش بہت پیار سے غسل دے رہی تھی۔

کڑھی پتے کے باریک اور نازک پتیاں بھی دھل چکی تھیں...... کھڑکی کا پٹ کھول کر بیٹھی تو مجھے اپریل کے تیسرے ہفتے میں خنکی کا احساس ہوا۔ سردیوں کے کپڑے سنبھال چکی تھی...... ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جسم کو تو راحت دے رہے تھے مگر کندھوں اور پٹھوں کو بار بار احساس دلا رہے تھے کہ ان بوڑھے ہوتے اعضا کو سنبھال لو اور گرم شال کے آنچل میں چھپا لو......

میں نے الماری کھولی تو کپڑوں سے بھری الماری میں چھپی ہوئی ایک سرمئی شال مل گئی اور میں نے فوراً شانوں پہ اوڑھ لی...... اور پھر اپنے کپڑوں کو غور سے دیکھنے لگی......

میرے بچوں کو تو ان کی ضرورت نہیں...... میرے بعد کون پہنے گا یہ سب......؟

کس کی ملکیت میں جائیں گے یہ رنگ برنگے بے جان ملبوسات......؟

اوہ میرے ہینڈ بیگ......؟

میری جیولری......؟

اُف میری کتابیں...... جن کے لیے میں نے ڈریسنگ ٹیبل نکال کر جگہ بنائی تھی......

کچھ دیر تک تو میں سوچتی ہی رہی، مجھ سے وابستہ اتنی ڈھیروں چیزیں کیوں ہیں؟

جنھیں میں نے سالوں کی مشقت کے بعد جمع کیا تھا......

مگر میں ابھی مرنے والی تو نہیں...... بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں دنیا چھوڑ کر جا رہی ہوں......

اور نہ یہ ضروری ہے کہ گرد و پیش پھیلی ہوئی یہ جان لیوا وبا میرا ہی گھر ڈھونڈ لے گی۔

ماحول میں بڑھتے ہوئے خوف نے آواز دی......

ارے بھئی کن خیالوں میں گم ہو...... جانتی نہیں کیسی وبا پھیلی ہوئی ہے۔

دو ہفتے......اور پھر اگلے دو ہفتے......اور پھر اگلے دو ہفتے!

جان تو سولی پر لٹکتی رہے گی نا......

کیا پل رہا ہے میرے اندر......اور کب سے پل رہا ہے کسے خبر۔

بارش ختم ہو چکی تھی۔ لوکاٹ کے پتوں سے کوئی کوئی قطرہ ہوا کے لہرانے سے زمین پر گر جاتا۔

میں نے اندر کے خوف کو باہر کے اُجلے پن سے دور کرنے کے لیے غسل کیا، نئے کپڑے پہنے......اور میاں سے کہا آیئے باہر کے حالات دیکھنے چلتے ہیں......

راستے میں دوستوں اور ہم خیال ساتھیوں کا خیال آتا رہا......

کورونائی ماحول کو توڑتے ہوئے کس کے گھر جایا جائے......؟

منیرہ......

نہیں بھئی نہیں اس نے تو گھر کے باہر ''ہنسنا منع ہے'' کا بورڈ لگایا ہوا ہے جب فون کرو جواب ملتا ہے:

حالات بہت خراب ہیں......کورونا دن بدن بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ تمہیں حالات کا ادراک ہی نہیں......لاشیں اُٹھانے والا کوئی نہیں......

نمازِ جنازہ کے بغیر ہی دفن کیا جا رہا ہے۔ بس نعیم بہت ڈیپریشن ہے اللہ ہی رحم کرے۔

ناہید......

جس کے لبوں پر ہنسی اور لفظوں میں اُمید ہی رہتی ہے۔ حکومتِ وقت کی سخت مخالف......

ارے نعیم دیکھا تم نے ہمارے پرائم منسٹر کا پوری دنیا میں مذاق بنا ہوا ہے۔ لفظوں پر غور کیا کبھی......

تقریر بھی نہیں کرنی آتی۔ کورونا کے حوالے سے سارے انتظامات ناقص اور بے عقلی پر مبنی ہیں۔

سلمان باسط......

وہ جو لاک ڈاؤن کے توڑنے کی بات کرتا ہے مگر خود نہیں توڑتا...... بیبا بچہ کہیں کا...... نہ کھلکھلا کر ہنستا ہے نہ ہر کسی سے بے تکلف ہونا پسند کرتا ہے۔ اپنے اردگرد ایک مضبوط حصار سا بنائے رکھتا ہے...... اور کبھی کبھی اس حصار کے اندر سے جھانک کر اپنی خوبصورت شاعری اور سحر انگیز نثر کے تعویز بنا کر دوستوں کی طرف اچھال دیتا ہے۔ ان تعویزوں کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے اور یوں قاری کو کبھی کبھار اس کی ذات کے سفر میں شریک ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔

شہزاد اظہر......

ارے نہیں بھئی نہیں......کون سنے اتنی دقیق مشکل اور سنجیدہ باتیں......اس ذہین انسان سے مکالمہ کرنے کے لیے بہت سی فرصت چاہیے۔

محمد علی......

چھوڑیں جی......جھکی جھکی نظریں سعادت مندی کے جذبوں اور نپے تلے جملوں کے ساتھ کہاں تک خود کو سنبھال کر گفتگو پر بندھ باندھے جائیں۔

عائشہ مسعود......

کام کام اور صرف کام......اسے فرصت کہاں کہ ادھر اُدھر جھانک کر آلتو فالتو باتوں میں وقت ضائع کرتی پھرے۔ سوچنے سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیتوں سے مالا مال......

قیصرہ علوی......

باندھ رکھا ہے اسے اس کے عزیزوں نے......کورونا کی وجہ سے......وگرنہ اب تک تو کئی دعوتوں میں بلا چکی ہوتیں۔ محبت پیار اور مہمان نوازی کے جذبوں سے سرشار۔ ہر آنے والے کا راہ تکتی، دل و جان سے خوش آمدید کہتی، محبت کے جوان جذبوں کے ساتھ مسکراتی ہوئی......مگر ہائے رے کورونا۔

تحریم ظفر......

بیماریوں سے لڑتی......قوت مدافعت کو جمع کرتی، ہنستی ہنساتی خوشیاں بکھیرتی......اُمید کے چراغ روشن کرتی، پنجابی زبان کی مٹھاس اور صوفیائے کرام کی عقیدت مند......دل و دماغ میں فکر و

دانش کے موتی سنبھالے اپنے لہجے کی تمام تر شیرینی کے ساتھ ہمدرد تحریم...... مگر ہائے رے کورونا...... تیرا ستیاناس ہو۔

ماریہ معود......

سمجھدار، سلیقہ شعار، ترتیب و توازن کے ساتھ نپی تلی گفتگو کرنے والی ہمدرد اور محبت سے لبالب بھری دوست...... مگر سماجی فاصلہ بھی تو ضروری ہے......

فرحت اعوان...... میری جان، مخلص و جان نثار ہمدرد دوست اور بہن مگر دور بہت دور کورونا کی وجہ سے مقید ہو گئی ہے۔

شہلا حسن زیدی......

گفتگو میں بانکا پن، جی دار ہنسنے کھیلنے اور دل لگانے والی...... بے تکلف اور سراپا محبت، سراپا پیار اور وفا کی خوشبو سے مالا مال کہاں جا بسی...... کہاں ڈھونڈوں اُسے...... امریکہ جانا تو محال ہے نا!

فریدہ حفیظ......

تجربے، مشاہدے اور علم و آگہی میں گندھی دوست...... مگر لاک ڈاؤن......

چلیے جی جبار مرزا کی طرف چلتے ہیں، ڈاکٹر مقصودہ کی طرف چلتے ہیں...... سلمٰی اعوان کی طرف چلتے ہیں...... لطیفے پھلجھڑیاں، امید و یقین، کھلے ذہن، کھلکھلاتے قہقہے...... بچوں کی طرح معصومیت سے گنگناتی زندگی، خوف کے جبر سے آزاد۔ لفظوں، جملوں کے پسِ منظر سے جھانکتے مفہوم دُکھ کی پرچھائیوں کو دور کرنے والے محبت بھرے الفاظ......

گھٹن اور حبس کے اِس موسم میں تازگی کے احساس کے ساتھ کچھ دیر ہنسنے کے لیے......

وگرنہ تو دل کا قلم بار بار سیاہی میں ڈبو ڈبو کر بھی گھسیٹنا مشکل ہو جاتا ہے......

گیٹ سے باہر ایک موٹر سائیکل آ کر رُکی

گیٹ سے باہر ایک موٹر سائیکل آ کر رُکی......

ایک پیارا سا لڑکا اُترا......

اس نے موٹر سائیکل سے اُتر کر ہیلمٹ اُتارا تو اس کے خوبصورت بڑے بڑے بالوں نے بکھر کر چہرے کو چھپالیا۔

اس کا باقی چہرہ ماسک میں چھپا ہوا تھا۔

کھڑکی سے تمام مناظر واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔ باہر کی تیز روشنی نے کمرے کے عکس کو دھندلا سا کر دیا تھا۔ لڑکے نے موٹر سائیکل کے سٹینڈ کو پاؤں سے باہر کی طرف کھینچا اور اس کے ساتھ موٹر سائیکل کو کھڑا کر دیا۔

گلی میں لوگوں کی آمدورفت جاری تھی......ارد گرد کے تمام گھروں کے مکین اپنے اپنے گھروں میں مقید تھے۔ وہ لڑکا سلیقے سے چلتا ہوا گیٹ کے پاس آیا اور گھر کے مکینوں کو متوجہ کرنے کے لیے گھنٹی بجادی۔ میں ذاتی طور پر تو اس لڑکے کو نہیں جانتی تھی مگر کافی دیر سے اسی کا انتظار کر رہی تھی۔

کیونکہ میری ایک دوست نے اسے میرے پاس بھیجا تھا۔

مجھے چاہیے تھا فوراً بھاگ کر گیٹ کی طرف جاتی......مگر میں اس کی شخصیت کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے اسے مسلسل کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہی تھی۔

گھنٹی کی آواز سن کر میں نے لفافہ اُٹھایا......لفافے کے ساتھ پڑے ہوئے ماسک کو اپنے

ناک اور منہ پر چڑھایا اور کمرے سے نکل کر گیٹ کے پاس آ گئی۔

کئی سوال میرے لبوں پر مچلنے لگے۔

بیٹا یہ موٹر سائیکل آپ کی ہے؟

نہیں آنٹی کسی دوست کی ہے۔

دادا کا کیا حال ہے؟

انھیں تو فالج ہو گیا ہے......

اوہ کینسر بھی آخری اسٹیج پر ہے۔

تم کیا کرتے ہو؟

فرسٹ ایئر میں تھا اب پڑھائی چھوڑ کر نوکری کی تلاش کر رہا ہوں۔

بہن......؟

اس نے بھی پڑھائی چھوڑ دی ہے۔

اور امی......؟

امی ان دونوں بیماروں کو سنبھالتی ہیں۔

لاک ڈاؤن......قرنطینہ......کورونا اور مجبور زندگی......

میں ان تینوں میں الجھ کر سوچتی رہی:

کہ ان میں سے پہلے، دوسرے، تیسرے اور چوتھے نمبر کی ترتیب طے کرنے کے لیے کیا کروں......؟

کھڑکی کا طلسم

کھڑکی کا طلسم زندگی کے ماہ وسال کو یوں میرے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ جسے وہ میرا ماضی نہیں میرے حال کو سنوارنے کے لیے میرے ارد گرد محو رقص ہوں۔ واقعات تیز آندھی میں سڑکوں پر اڑتے پھرتے وہ خس و خاشاک بن جاتے ہیں۔ جنھیں میں پکڑتے پکڑتے ہانپنے اور کانپنے لگتی ہوں۔

میرا اور میری ماموں زاد کا لڑکپن کا زمانہ تھا۔ لا ابالی اور کھلنڈرا سا...... میری نوے سالہ نانی کا بیڈ گھر کی پہلی منزل پر بالکل کھڑکی کے ساتھ ہوتا تھا اور وہ دِن بھر کھڑکی کے باہر گلی کی رونق دیکھتی رہتی تھیں۔ کبھی رات کو نیند نہ آتی تو خدائی صفات کا ورد کرتے ہوئے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر کھمبوں پر روشن بلب کی روشنی، سڑکوں کی بے رونقی اور گلیوں کا سکوت دیکھ کر وقت گزار لیتیں۔

ایک دن، ہم دونوں بہنیں ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں تو دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ نانی اماں کچھ گنگناتے ہوئے زار و قطار رو رہی ہیں۔ موٹے موٹے آنسو اُن کے جھریوں بھرے چہرے سے پھیلتے ہوئے اُن کے آنچل میں چھپ جاتے۔ ہم نے خاموشی سے سننے کی کوشش کی۔ تو وُہ گا رہی تھیں۔

باپ مرے سر ننگا ہوندا تے ویر مرن کنڈ خالی
ماواں باج محمد بخشا کون کرے رکھوالی

ہم نے پوچھا نانی اماں کیا ہوا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہنے لگیں سارا شہر بس رہا ہے مگر یہاں مجھے کہیں بھی اپنے بھائی نظر نہیں آرہے۔ میرا اس بھری دنیا میں کوئی نہیں۔ بھائی

بہنوں کے جنازوں کو کندھا دیتے ہیں مگر میرا تو کوئی بھائی نہ رہا اور وہ اُن کے نام لے کر ہچکیاں لے کر رونے لگیں۔ ہمیں اُس وقت نہ تو حالات کی سنگینی کا اندازہ تھا اور نہ ہی وچھوڑے کے درد کا احساس...... ہمارے لیے یہ بات عجیب تھی کہ نوے سالہ بوڑھی خاتون اِس عمر میں اپنے بھائیوں کو یاد کر رہی ہیں۔ آدھی سے زیادہ صدی گزارنے کے بعد آج وہ آنسو میری آنکھوں سے نکل کر پلکوں پر ٹھہر کر مجھ سے پوچھ رہے ہیں...... تم جانتی ہو" جوانی کا دُکھ کیا ہوتا ہے؟"

تنہائی کی لمبی راتوں میں سسکتی یادیں دُکھ سُکھ کی ریشمی تاروں میں اُلجھتی سلجھتی جب تن من کے گرد گھیرا ڈالتی ہیں تو کیا محسوس ہوتا ہے......؟

کورونا کا وبائی مرض تیزی سے گردوپیش پھیلتا ہوا رشتوں کی ڈوری کو ہلا رہا ہے اور دِل کے نازک تاروں پر آنسوؤں کی فصل تیار ہو کر میرے آنچل کو بھگوتی ہے تو مجھے اپنی نانی کے وہ موٹے موٹے آنسو یاد آتے ہیں......

میرا بھائی کورونا کی زد میں آیا تو مجھے بھی آج محمد بخش صوفی بزرگ کا کلام بہت یاد آیا۔

میرے دو بھائی ہیں دونوں ہی مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں۔ بڑا بھائی اور میں اوپر تلے کے ہیں۔ لہٰذا زندگی بھر اُس کا ساتھ سائے کی طرح میرے ساتھ رہا۔ کبھی پناہ کے سائے میں میرا وجود محفوظ رہا، کبھی وہ محافظ کے روپ میں میرا وارث بن جاتا۔ کبھی مشکلوں مصیبتوں شرارتوں میں میری ڈھال بن جاتا، کبھی غمگسار کبھی دوست......

کبھی محبت کبھی عداوت...... کبھی چڑ جاتا...... یہ ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ کیوں چپکی رہتی ہے...... اپنی کھٹی میٹھی یادوں کے ساتھ زندگی کا سفر گزرتا رہا...... اور میں اُس کی انگلی پکڑے زندگی کے کٹھن سفر طے کرتی رہی۔

میری والدہ کی بہت لیٹ عمر میں شادی ہوئی تھی۔ میری پیدائش خاندان میں کوئی اہم خبر نہ تھی۔ ہاں البتہ یہ اہم خبر تھی کہ اب اولاد کا سلسلہ چل نکلا تھا...... بیٹے کی اُمید کی جا سکتی تھی...... بیٹا پیدا ہوا تو میرے تایا نے خوشی کے مارے چھت سے چھلانگ لگا دی۔ گھر گھر لڈو بانٹے گئے اور میری ماں کے وجود کو تسلیم کر لیا گیا۔

زندگی بھر میرا بھائی ماں کی آنکھوں کا تارا رہا اور ماں میرے بھائی کی آنکھوں کا تارا تھیں۔

میں تو بس ایک اضافہ تھی۔ میرے بارے میں میری ماں کا خیال تھا کہ میں بہت نک چڑھی...... لاابالی کم عقل اور کام چور ہوں۔

وہ میری اِس خود ساختہ تصورات پر مبنی طبیعت ہی کی تربیت کرتی رہتی تھیں۔ میرا یہ بھائی بچپن ہی سے بہت سنجیدہ، سمجھدار اور ذمہ دار قسم کا تھا...... میری امّی بتایا کرتی تھیں کہ اُس زمانے میں صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کر کے چارپائیاں بچھا کر سوتے ہوئے جب کبھی بارش آ جاتی تو تم بھاگ کر کمرے میں چلی جایا کرتی تھی...... اور میرا یہ بھائی اپنے ننھے وجود کے ساتھ اپنے سے زیادہ بوجھ کا اپنا بستر گھسیٹ کر لے جانا نہ بھولتا۔

اوّائل عمری سے ہی چیزوں کو توڑ کر جوڑنے کا بہت شوق تھا۔ ابو کو پرانے گانے سننے کا بہت شوق تھا۔ وہ گھر میں ٹیپ ریکارڈ لے کر آئے تو یہ کچھ دِن تو دیکھتا رہا۔ آخر ایک دن نہ رہا گیا۔ ابو کہیں کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اس نے پورا ٹیپ ریکارڈر کھولا اور پھر جوڑنا بھول گیا۔ اتنی دیر میں ابو آ گئے۔ ابو کی آمد کا سنتے ہی یہ اتنا خوفزدہ ہو گیا کہ گھر سے بھاگ گیا...... ابو نے ٹیپ ریکارڈر کی حالت دیکھی تو غصے سے لال ہو گئے۔ بھائی کی ڈھنڈیا مچی مگر وہ کہیں نہ ملا۔ ٹیپ ریکارڈر کی توڑ پھوڑ تو بھول گئی...... اور سارا گھر اِسے تلاش کرنے میں لگ گیا، شام ہو گئی۔ امّی کی حالت غیر ہونے لگی۔ ابو کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے...... اور پھر رات گئے بھائی مل گیا۔ کسی عمارت کی دیوار کے ساتھ بھوکا پیاسا چھپ کر بیٹھا ہوا...... سب نے خدا کا شکر ادا کیا اور ٹیپ ریکارڈر کی توڑ پھوڑ کسی کو یاد نہیں رہی......

میرا یہ بھائی امان اللہ میرے لیے وہ چراغ تھا جس کی روشنی نہ ہوتی تو میں اندھیروں میں بھٹکتی رہتی۔ وہ پڑھتا تو مجھے بھی پڑھنے کا موقع مل جاتا۔ وہ جاگتا تو مجھے بھی جاگنے کا موقع مل جاتا۔ اُس کی تفریح میں ہی میری تفریح کا کوئی نہ کوئی پہلو نکلتا...... مجھے یاد ہے بچپن میں ہم جس جگہ رہتے تھے وہاں ڈش انٹینا سے انڈیا کی فلمیں ہمارے ٹی وی پر بہت صاف اور شفاف نظر آتی تھیں۔ مجھے فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا مگر میرے بھائی نے شاید زندگی بھر کوئی فلم پوری نہیں دیکھی۔ وہ دوستوں کے ساتھ سینما ہال بھی جاتا تو انٹرول سے اُٹھ کر آ جایا کرتا تھا۔ سو مجھے فلم دیکھنے کی اجازت اُس وقت تک ہوتی جب تک میرا بھائی دیکھ رہا ہوتا۔ اگر وہ سوجاتا تو ٹی وی بند ہو جایا کرتا تھا......

اِسی طرح امتحان کی تیاری بھی میرے لیے اُس وقت تک ضروری ہوتی جب تک میرا بھائی پڑھ رہا ہوتا...... مجھے یاد ہے کہ میں اپنے شوق کی تکمیل کی خاطر اُس کے تمام احکامات کو پورا کرتی۔ مثلاً اُس کی پسند کا کھانا بنا کر دیتی اُس کے سارے کام کرتی۔ تب کہیں جا کر وہ میرے لیے جاگتا...... یا میرے کسی شوق میں ڈھال بن کر مجھے محفوظ پناہ گاہ مہیا کرتا۔

یہ اُس زمانے کا واقعہ ہے جب میرا بھائی کالج میں تھا۔ محکمہ انہار کا بنگلہ شہر سے بہت دور تھا اور میرے بھائی کو سخت سردی میں کماد کی بڑی فصلوں کے درمیان سے پگڈنڈیوں سے گزر کر کئی کلومیٹر دور اسٹیشن پر جانا پڑتا وہاں سے ٹرین پر بیٹھ کر شہر اور پھر وہ ریلوے اسٹیشن سے کئی کلومیٹر دور پیدل چل کر کالج جاتا۔ امّی تہجد پڑھ کر اُس کا ناشتہ بناتیں اور اتنی دیر تک تسبیح کے دانے گھماتی رہتیں جب تک کہ ٹرین کی آواز نہ سن لیتیں۔

ایک دن بھائی نے امّی کو بتایا کہ فلاں گاؤں کی انتہائی خوبصورت لڑکی چپل پہنے کماد کی فصل سے کورے پر پاؤں رکھتی سخت سردی میں منہ اندھیرے میرے ساتھ اسٹیشن تک جاتی ہے۔ ہم کچھ فاصلے پر اکٹھے چلتے رہتے ہیں اور میں اُس کی حفاظت کرتا ہوں تا کہ کوئی اُس کے ساتھ زیادتی نہ کرے...... اُس کے گاؤں جا کر معلوم کریں کون سی ایسی مجبوری ہے جو اُسے اِس سخت موسم میں اتنی سختیوں کو برداشت کرنے پر مجبور کرتی ہے......

اور اُسے بند جوتا بھی دلائیں۔

امّی نے معلومات اکٹھی کیں تو پتہ چلا کہ کسی وڈیرے کی بھولی ہوئی داستان ہے...... کردار تو زندگی میں گم ہو جاتے ہیں مگر واقعات کا تاثر ہمیشہ قائم رہتا ہے...... اندھیرے میں...... کماد کی فصل کے اندر چھپی پگڈنڈی پر جوان اور حسین لڑکی بھی اُس کا ایمان متزلزل نہ کر سکی۔ اُس کی ساری زندگی صاف شفاف پہاڑوں کی کوکھ سے جنم لینے والے ٹھنڈے میٹھے چشمے کی مانند رہی جس میں آلودگی کا شائبہ تک نہ تھا۔ ہمیشہ ماں باپ کا تابع فرمان رہا۔ بڑے بڑے عہدوں پر رہا اور ساری زندگی انتہائی ایمان داری، فرض شناسی، کفایت شعاری اور سمجھداری سے گزاری۔

میرے چھوٹے بھائی کو کبھی پڑھائی سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ماں باپ کی ساری کوششیں اُسے پڑھائی کی طرف راغب کرنے میں ناکام ہو جاتیں تو امّی جائے نماز پر بیٹھ کر دعاؤں میں مشغول ہو

جاتیں......اُس کے مستقبل کے بارے میں بہت فکر مند رہتیں، بہت ذہین اور شرارتی تھا۔

ہمارے گھر کے ساتھ جانوروں کے لیے الگ حویلی ہوتی تھی۔ اساتذہ کی شکایات اور اسکول سے بھاگ جانے کی عادتوں سے تنگ آ کر ایک دن میرے والد نے اِسے بٹھایا اور پوچھا بیٹا آج مجھے صاف صاف بتا دو کہ پڑھنا ہے یا بھینسوں کو چارہ ڈالنا ہے۔ اُس نے کہا بھینسوں کو چارہ ڈالنا ہے۔ میرے والد نے اِسے بھینسوں والے کمرے میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی اور کہا کہ بس اب جانوروں کے ساتھ رہو۔ اسی کمرے میں تمھاری چارپائی بچھ جائے گی اور یہیں تمھیں کھانا ملا کرے گا۔

کئی گھنٹے اُس کمرے میں گزارے تو باہر نکل کر معافی مانگی کہ نہیں اب میں پڑھوں گا۔

میرا بھائی سیف اللہ جسے ہم پیار سے سیفی بلاتے ہیں مجھ سے پانچ سال چھوٹا تھا۔ پیدا ہوا تو امّی بہت بیمار ہو گئیں لہٰذا یہ میرے بہت قریب آ گیا۔ بچپن سے آج تک مجھے ماں ہی سمجھتا ہے۔ بچپن میں ہمیشہ میرے قریب رہتا تھا۔

ابو کی طویل بیماری میں جب ہم گاؤں رہنے کے لیے گئے تو ہمارے گھر کے ساتھ ہی ایسا خاندان مقیم تھا، جن سے ہمارے سالہا سال سے دیوانی مقدمے چل رہے تھے۔ خاندان کے بیشتر افراد یہ مقدمے لڑتے لڑتے مر گئے اور دوسری نسل کو وراثت میں نفرت بھرے یہ مقدمے دے گئے۔ اب دوسری نسل بھی بڑی ہی ثابت قدمی سے اِس وراثت کو سنبھالے بھگت رہی تھی۔ دونوں گھروں کے درمیان ایک گہرا کنواں تھا۔

میں گھر میں نظر نہ آئی تو میرا یہ بھائی روتا روتا گلی میں آ گیا اور کنویں کے پاس جا کر اونچی آواز میں رونے لگا...... دشمن خاندان کے بزرگ فرد نے دیکھا تو بچے سے پوچھا کیا ہوا اُس نے روتے ہوئے کہا میری باجی گم ہو گئی ہے......

دشمنی کی انتہا دیکھیں اُس نے موقع غنیمت جانا اور بچے سے کہا وہ اِس کنویں میں اُتر گئی ہے اور خود کھسک گیا...... روتے ہوئے بچے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کنویں کے اردگرد بند دیواروں پر چڑھ کر کنویں میں کودنے لگا تو کسی مہربان نے دیکھ لیا اور یوں اُس کی جان بچ گئی۔

میری والدہ نے ہم تینوں بچوں کی تربیت کچھ اِس انداز سے کی تھی کہ حرام، حلال...... فرض

شناسی اور احساسِ ذمہ داری......عبادت گزاری اور مسلمان ہونا ہماری تربیت میں گوندھ کر ہمارے جسم و جان کا حصہ بنا دیا تھا......ہم چاہتے بھی تو اِس راہ گزر سے ہٹ کر دائیں بائیں نہیں جھانک سکتے تھے۔ میرے دونوں بھائیوں نے جس طرح ماں باپ کی خدمت کی اُس کی مثال نہیں ملتی۔ کبھی شکوہ یا شکایت نہیں کی اور ہمیشہ یہ کہتے ہوئے اتراتے ہیں کہ ہم بہت خوش نصیب ہیں، ہمیں ماں باپ کی خدمت کا موقع ملا۔

آج کے زمانے میں اخلاقی تنزلی دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں، ماں باپ کے کردار اور تربیت میں بھی بہت تبدیلی آئی ہے......

بچپن کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ میرے چھوٹے بھائی نے کہیں سے کوئی شعر سن لیا۔

بڈھا مر گیا بڈھی تنگ
ویکھی جا مولا دے رنگ

ہمارے گھر میں ایک خاتون کام کرتی تھیں اور خاصی بوڑھی تھیں۔

یہ اُس کے ارد گرد گھوم گھوم کر اُسے چھیڑنے کے انداز میں گا رہا تھا کہ میرے والد نے سن لیا......انھوں نے ایک چھڑی لی اور اِسے پکڑ کر گھر لے آئے۔ اُس بزرگ مددگار کو بھی گھر میں بلایا اور میرے چھوٹے بھائی سے کہا فرش پر ناک رگڑ کر اُس مددگار سے معافی مانگے۔ میرے والد نے اُن سب لوگوں کو بلا لیا جن کے سامنے یہ لہک لہک کر گا رہا تھا......

ہماری مددگار بہت کہتی رہی ملک صاحب بچے کی شرارت تھی، معاف کر دیں مگر میرے والد نے جب تک اُس سے معافی نہیں منگوائی معاف نہیں کیا۔

اِس کا اثر زندگی بھر رہا۔ آج بھی ہم تینوں بہن بھائیوں کو کبھی جرأت نہیں ہوئی کہ کسی بزرگ کی بے ادبی کریں۔

میرے اس چھوٹے بھائی نے بھی ماں باپ کی اتنی خدمت کی جو بیان سے باہر ہے۔ زندگی میں اچھے بُرے حالات بھی رہے مگر کبھی ایمان داری اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا......اور ہمیشہ ثابت قدم رہا۔

کھڑکی کے اُس پار

کرونا کے شب و روز

انسان مسافر ہے اور زندگی سفر؛ یہ سفر ماں کی نرم گرم آغوش سے ہی شروع ہو جاتا ہے جب وہ پانی کے دائرے میں تیرتا ہوا ہاتھ پاؤں مارنا شروع کرتا ہے۔

زندگی میں جسمانی سفر کی راحتیں، صعوبتیں، محبتیں اور مصیبتیں بگولوں کی طرح اسے اڑائے پھرتی ہیں۔ سفر کے کسی حصے میں اسے گمان ہوتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جی رہا ہے اور کہیں اسے لگتا ہے کہ کوئی گوشمالی کرتے ہوئے اسے دل و دماغ کی زمین سے دور اس کی مرضی اور منشاء کے بغیر الجھے راستوں پر لیے لیے پھر رہا ہے اور وہ محض آنکھیں بند کر کے چلا جا رہا ہے مگر حیرت ہے راستہ کتنا بھی کٹھن ہو سماج کتنا بھی سنگدل ہو، نہ دل دھڑکنا بند کرتا ہے اور نہ دماغ سوچنا اور خواب دیکھنا بند کرتا ہے۔ تخلیق کار کی موج یہ ہے کہ وہ نامساعد حالات میں اپنے دل کی دنیا آباد کر کے داخلی سفر کو آباد کر لیتا ہے۔

جب کرونا نے حملہ کیا تو دنیا بھر کے لوگوں کو گھروں میں مقید کر دیا گلیوں میں چرند پرند، آوارہ کتے یا پھر پودوں پر کھلنے والی نئی کونپلیں، پھل پھول اور درختوں سے گرنے والے پتے ہی تھے جنھیں میں اپنے ڈرائینگ روم کی کھڑکی سے دیکھا کرتی تھی۔ باہر سے ناطہ کیا ٹوٹا دل کی دنیا میں یادوں کے سفر نے انگڑائی لی اور مجھے تازہ دم کر دیا اور میں نے فیس بک پر لکھنا شروع کر دیا۔ اتنی پذیرائی ملی کہ جس دن نہ لکھتی ملک کیا بیرون ملک سے بھی فون آنے لگتے آج کی قسط کیوں نہیں لکھی۔ یہ محبت بھرے پیغامات میرے لیے انرجی ڈرنک ثابت ہوئے میری حوصلہ افزائی ہوئی۔ میری تحریر میں نکھار آتا گیا اور میرے حوصلے بلند ہوتے چلے گئے۔ یہ تحریریں محلے سے شروع ہو کر قریہ قریہ گھومتی ہوئی میری زندگی تک آ پہنچیں اور پھر یادوں کا سلسلہ تو اُڑتے بادل کی طرح ہے کبھی کہیں تو کبھی کہیں۔ میں ان دوستوں، مہربانوں، خیر خواہوں اور قدردانوں کی ممنون ہوں اور ان کے نام میرے دل میں ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں۔ میں جانتی ہوں محبت کے دو جملے، پیار کے دو بول، حوصلہ افزائی کی صرف ایک نظر آپ کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر دیتی ہے۔ تو دوستو! اگر میرے لفظوں میں سلیقہ، یادوں میں سچا پن، تحریر میں خلوص کی مہک اور جرأتِ اظہار نظر آئے تو یہ سب آپ کی دین ہے۔

(نعیم فاطمہ علوی)